

Downloaded From paksociety.com

صائمہ اکرم چوہدری



سیاہ حاشیہ پار مت کرو۔ ”پچھتاؤ گی۔ ایک نادیدہ آواز روکتی رہی لیکن وہ لڑکی نہ رکی۔ سیاہ حاشیہ عبور کر گئی اور تب اسے احساس ہوا کہ اپنے لیے جہنم خرید چکی ہے۔



عدینہ کاٹھ کباڑ میں اپنی پرانی ڈائریاں تلاش کر رہی ہے تو اسے ایک کتبہ ملتا ہے۔ جس پر اس کی والدہ صالحہ رفیق کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات درج ہوتی ہے۔ وہ بری طرح الجھ جاتی ہے۔ اس کی والدہ تو زندہ ہیں پھر یہ کتبہ کس نے اور کیوں بنوایا ہے۔ تب ہی اس کی والدہ صالحہ آجاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ڈائریاں تو انہوں نے ردی والے کو دے دی ہیں۔ عدینہ کو بہت دکھ ہوتا ہے پھر اسے کتبہ یاد آتا ہے تو وہ سوچتی ہے کہ عبد اللہ سے اس کے متعلق پوچھے گی۔ عبد اللہ پابند صوم و صلوة وہ مسجد کا موزن بھی ہے اور اس نے عربی میں ایم فل کر رکھا ہے عدینہ کی اس کے ساتھ منگنی

ماہنامہ شعاع دسمبر 2015 218

READING
Section

Downloaded From paksociety.com

نکاحِ ولایت

ہو چکی ہے۔ عدینہ ہاسٹل میں رہتی ہے اور میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔
عدینہ کے والد مولوی رفیق کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ اپنی ماں سے زیادہ دادی سے قریب ہے مونا اس کی کزن ہے۔ وہ
حویلیاں شہر سے قرآن حفظ کرنے ان کے گھر آئی ہے۔
عدینہ عبد اللہ سے بہت محبت کرتی ہے۔ عبد اللہ بھی اسے چاہتا ہے لیکن شرعی اصولوں کے تحت زندگی گزارنے والی
صالحہ آپا نے منگنی ہونے کے باوجود انہیں آپس میں بات چیت کی اجازت نہیں دی۔
شانزے ماڈل بننا چاہتی ہے۔ ریمپ پرواک کرتے ہوئے اس کا پاؤں مڑ جاتا ہے اور وہ گر جاتی ہے۔
ڈاکٹر بینش نیلی کو بھی میں اپنے بیٹے ارجم کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کے شوہر کرنل جاوید کا انتقال ہو چکا ہے۔
نیلی کو بھی کے دوسرے حصے میں ان کے تایا ڈاکٹر جلال اپنی بیوی اور پوتی اوریدا کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی دوشادی
شدہ بیٹیاں ہیں اور اکلوتا بیٹا تیمور لندن میں مقیم ہے۔ بیوی کی وفات کے بعد تیمور نے اوریدا کو پاکستان اپنے باپ کے پاس
بھجوا دیا ہے۔ بیٹا ماہیر ان کے پاس لندن میں ہے۔
اوریدا اور ارجم کی بہت دوستی ہے جو ڈاکٹر بینش کو بالکل پسند نہیں۔ ڈاکٹر بینش تیمور کے نام سے بھی نفرت کرتی ہیں۔
عبد اللہ عدینہ کو اپنا سیل نمبر بھجوانا ہے۔ صالحہ آپا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ شدید غصہ ہوتی ہیں اور نمبر بھاڑ کر پھینک دیتی ہیں۔
سربہ اپنے دوست کے پروڈکشن ہاؤس میں جاتا ہے تو وہاں شانزے کو دیکھتا ہے۔ شانزے اس کی منتیں کر رہی ہے کہ وہ
ایک چانس اسے دے کر دیکھے۔

شانزے سخت مایوسی کا شکار ہے۔ رباب اس کی روم میٹ اسے تسلی دیتی ہے تو وہ بتاتی ہے کہ اس کا دنیا میں کوئی نہیں
ہے صرف ایک پھوپھی ہیں جن کے گھر میں اسے کوئی پسند نہیں کرتا۔ اس کی ماں اسے پھینک کر چلی گئی تھی اور باپ کو

کسی مذہبی جنونی نے قتل کر دیا۔ شانزے کا خاندان مسلمان ہے لیکن وہ کسی مذہب کو نہیں مانتی۔ ہاسٹل میں رہنے کے لیے اس نے کالج میں داخلہ لے رکھا ہے۔ وہ شوہر میں اپنا نام بنانا چاہتی ہے۔

آپا صالحہ نے عدینہ کی عبد اللہ سے منگنی توڑ دی ہے۔ عبد اللہ عدینہ سے ایک بار بات کرنا چاہتا ہے۔ عدینہ چھت پر جاتی ہے تو عبد اللہ وہاں آ جاتا ہے۔ آپا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ عدینہ کو برا بھلا کہتی ہیں اور اللہ کے عذاب سے ڈراتی ہیں۔

اورید اصرم کے ساتھ پیرو دینے جاتی ہے۔ اصرم باہر اس کا انتظار کرتا ہے۔ وہ اورید کو واپس لے کر آتا ہے تو ڈاکٹر بینش اسے بہت ڈانٹتی ہیں کیونکہ وہ ان کی گاڑی لے کر جاتا ہے۔ اورید اپنے باپ تیمور کو یہ بات بتاتی ہے تو وہ اس کو نئی گاڑی خرید کر دے دیتے ہیں، آغا جی کو یہ بات بری لگتی ہے۔

نی وی پر ایک مذہبی پروگرام دیکھتے ہوئے صالحہ آپا شدید جذباتی ہو کر رونے لگتی ہیں۔ عدینہ کو اسٹور روم کی صفائی کے دوران ایک تصویر ملتی ہے جو کسی مرد کی ہے۔

اصرم اورید کو گاڑی چلانا سکھاتا ہے۔ اورید اصرم کے امتحان میں کم نمبر آتے ہیں تو وہ پریشان ہو جاتی ہے۔

مونا عدینہ کو بتاتی ہے کہ آپا نے اس کی منگنی اس لیے توڑی کہ وہ چاہتی تھیں کہ عبد اللہ عدینہ سے فوراً شادی کر لے۔

عبد اللہ نے فوراً شادی سے انکار کر دیا تھا۔

عبد اللہ تبلیغی دورے پر جاتا ہے تو اس کا جہاز کریش ہو جاتا ہے۔ اور اس کے مرنے کی خبر آ جاتی ہے۔

عدینہ پر عبد اللہ کی موت کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ وہ اپنی ماں سے بری طرح بدظن ہو جاتی ہے۔

شانزے جب بھی کوئی غلط کام کرنا چاہتی ہے کوئی حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ رباب اسے سمجھاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے غلط راستوں سے بچانا چاہتا ہے۔

ارسل شانزے کو زخمی ہونے پر تسلی دیتا ہے، وہ بتاتا ہے کہ ایڈ میں کام کے لیے اس نے سفارش کی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ شانزے اسے اپنا بھائی سمجھے۔

اصرم بہت اچھے نمبروں سے ایف ایس سی کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر بینش اس خوشی میں ڈنر دیتی ہیں۔

عدینہ فیصلہ سنا دیتی ہے کہ اسے ڈاکٹر نہیں بننا۔ یہ سنتے ہی آپا صالحہ شدید پریشان ہو جاتی ہیں۔

نویں قسط

ٹرین ایک دفعہ پھر رات کے سناٹے میں بھاگتی جا رہی تھی۔ اکانومی کلاس کے کمپارٹمنٹ میں بیٹھے بختاور اور ہاشم کے چہروں پر محسوس کی جانے والی پریشانی اور افسردگی تھی۔ اسپتال میں ڈاکٹر ظہیر کے پہچاننے کے بعد ہاشم نے فوراً ہی کراچی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا کیونکہ انہیں علم تھا کہ ڈاکٹر ظہیر کے ذریعے بختاور کے والدین کا وہاں تک پہنچنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ اگلے تین گھنٹوں میں اپنے ساز و سامان کے ساتھ ایک دفعہ پھر ریلوے پر موجود تھے۔ ان کے اس طرح جانے پر صفدر کی بیوی کی خوشی دیدنی تھی اور اسی وجہ سے اس نے ساتھ لے جانے کے لیے کھانا بھی نفن میں باندھ دیا تھا۔

”ہم لوگ کہاں جائیں گے آخر؟“ بختاور کو ہاشم کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی دیکھ کر خوف سا محسوس ہوا۔

”لاہور۔“

”لیکن لاہور میں تو ہمیں تلاش کرنا ان کے لیے مشکل نہیں ہو گا۔“ بختاور نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔

”نہیں۔“ وہ پرسکون تھا۔ ”وہ لوگ یہی سمجھیں گے کہ ہم لوگ کراچی میں ہی کہیں چھپ گئے ہیں۔“

”یہ آنکھ مچولی آخر کب تک چلے گی ہاشم۔“ وہ بے

زار ہوئی، ویسے بھی آج کل اسے اپنی طبیعت عجیب سی محسوس ہو رہی تھی۔
”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ وہ پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔

”میرا نہیں خیال، وہ لوگ مجھے ڈھونڈیں گے۔“
بخٹاور نے کہا تو وہ چونکا۔ ”تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟“
”تم میرے باپ کو نہیں جانتے، وہ مجھے ڈھونڈنے سے زیادہ اس بات کا اعلان کرنے میں خوشی محسوس کریں گے کہ اچانک حادثے میں، میرا انتقال ہو گیا ہے۔“ بخٹاور کے لہجے میں تلخی تھی۔

”اللہ نہ کرے۔“ ہاشم نے بے ساختہ اس کے لبوں پر ہاتھ رکھا تو بخٹاور بے ساختہ مسکرا دی۔

”تمہیں پتا ہے لاہور میں ہم کہاں رہیں گے؟“
کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد ہاشم نے پراسرار انداز میں اس سے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”طلبی میں میرے نام پر دو تین شاہیں ہیں ان کے اور ایک چھوٹا سا چوہا رہتا ہوا ہے۔“ ہاشم کی بات پر بخٹاور کا دل عجیب سے انداز میں دھڑکا۔

”ہم لوگ اپنے گھر میں رہیں گے۔“ بخٹاور حیران لہجے میں بولی۔

”ہاں۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔
”لیکن وہاں تو کوئی بھی ہم تک پہنچ سکتا ہے۔“

بخٹاور پریشان ہوئی۔
”نہیں۔“ ہاشم مطمئن تھا۔ ”یہ دنیا کی واحد جگہ ہے جس کے بارے میں تمہارے اور میرے خاندان والے یہی سوچیں گے کہ ہم لوگ یہاں کبھی نہیں رہ سکتے۔“

”وہ کیسے؟“ بخٹاور کی آنکھوں میں تعجب ابھرا۔
”اپنی ناک کے نیچے کون دیکھتا ہے یا۔“ ہاشم اب مطمئن تھا۔ ”میں نے گراہیہ داروں سے کہہ دیا ہے کہ ایک ہفتے میں اسے خالی کر دیں۔“

”لیکن ایک ہفتہ ہم لوگ کہاں رہیں گے؟“ اس کی پریشانی کسی طور بھی کم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔

”میرے ایک فرینڈ کے گھر۔“ ہاشم کی بات نے اسے ایک دفعہ پھر خوف زدہ کیا، وہ تو ابھی تک صفدر کی بیوی کی تلخ باتوں کو نہیں بھولی تھی۔ ہاشم نے پھر سرعت سے اس کے ذہن میں ابھرتی سوچوں کو پڑھا۔
”ڈونٹ ٹیک ٹینشن، میرا فرینڈ بہت اسٹیبلش ہے اور ماڈل ٹاؤن میں خاصی بڑی کوٹھی ہے اس کی۔“ ہاشم کی بات پر وہ کچھ مطمئن ہوئی۔

”معاشی مسائل بہت سے خوب صورت رشتوں کا حسن خراب کر دیتے ہیں، اگر صفدر کے حالات ٹھیک ہوتے تو اس کی بیوی کا رویہ بالکل بھی ایسا نہ ہوتا۔“ ہاشم نے مسز صفدر کی طرف سے اس کا دل صاف کرنے کی کوشش کی۔

”وہ خاتون تب بھی ایسی ہی ہوتی۔“ بخٹاور کو رخسانہ بھابھی کی طرف سے کوئی ایسی خوش فہمی نہیں تھی۔ ”انسان کی فطرت کبھی نہیں بدلتی۔“ اس نے برا سامنے بنا کر کہا۔

”اول ہوں۔ بری بات ایسے نہیں کہتے۔“ ہاشم کی مجبوری تھی کہ وہ کسی کے بارے میں بھی غلط گمان نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کا اپنا دل ریا اور کھوٹ سے پاک تھا، اس لیے وہ دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا، اور اس کی آنکھوں پر ہمیشہ سے خوش گمانی کی ٹی بندھی رہتی تھی۔ بخٹاور نے الجھ کر اس کا چہرہ دیکھا اور خاموش ہو گئی۔ اسٹیشن پر گاڑی آچکی تھی اور ایک افرا تفری کا عالم تھا۔



آپا صالحہ نے عدینہ اور مونا کو رنگے ہاتھوں پکڑا تھا اور دونوں کی ٹانگیں تھر تھر کانپ رہی تھیں، کیونکہ انہیں علم تھا کہ آپا کی لغت میں یہ ایک ناقابل معافی جرم تھا، لیکن دونوں کو ہی یہ دیکھ کر دھچکا لگا کہ آپا نے محض ایک نظر ان دونوں پر ڈالی، اس ایک نظر میں کیا نہیں تھا، شکوہ، گلہ، ناراضی اور صدمہ۔

”آئی ایم سوری آپا۔“ عدینہ کے منہ سے لفظ ٹوٹ کر نکلے۔ آپا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

دکھا گیا۔

”آئی ایم سوری آیا۔“ وہ دل سے شرمندہ ہوئی۔
 ”تمہیں اپنی ماں پر اعتبار نہیں ہے شاید۔ تمہیں
 لگتا ہے کہ تمہاری ماں کے ماضی میں کوئی ایسا راز چھپا
 ہوا ہے جسے جاننا تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔ ہے
 ناں؟“

”ایسی بات نہیں ہے آیا۔“ عدینہ کا بس نہیں چل
 رہا تھا کہ آپا کی شکوہ کنناں نگاہوں سے دور جا کر کہیں
 چھپ جائے۔

”یقین مانو میں نے زندگی میں صرف ایک قدم غلط
 اٹھایا تھا اور انجانے میں اٹھائے گئے اس قدم کا خمیازہ
 ساری زندگی بھگتا ہے۔ پچھتاؤ کی وہ سوپ نے میرے
 سارے وجود کو جھلسا کر رکھ دیا تھا، لیکن جب تم پیدا
 ہوئیں تو مجھے یقین آگیا اللہ مجھ سے اتنا بھی خفا نہیں

ہے، ورنہ وہ مجھے اپنی رحمت سے کیوں نوازتا۔“
 آپا صالحہ کے منہ سے نکلنے والے الفاظ عدینہ کو
 رنجیدہ کر رہے تھے۔

”پوچھ لو آج تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتی ہو؟“ آپا
 صالحہ نے سپاٹ نگاہوں سے اپنی اکلوتی اولاد کی طرف
 دیکھا۔

”مجھے کچھ نہیں پوچھنا آیا۔“ عدینہ کے منہ سے
 پھسلا۔

”سوچ لو۔“ آپا نے اسے ایک اور موقع دیا۔
 تھوڑے فاصلے پر بیٹھی مونا نے اسے ہاتھ سے کئی
 اشارے کیے، لیکن عدینہ آج کسی اور ہی رنگ میں
 تھی۔

”ایک بات کی تسلی رکھو، تم کسی بد کردار عورت کی
 بیٹی نہیں ہو۔“ آپا نے اس کی پیٹھ میں ایک گرم سلام
 کھونپی۔

”میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔“ وہ تڑپ اٹھی۔
 ”پھر اپنی ماں کی کھوج لگانا چھوڑ دو، اسلام بھی
 خوا مخواہ کے تجسس اور ٹوہ لگانے کے عمل کو پسند نہیں
 کرتا۔“ آپا صالحہ کے لہجے میں ہلکی سی ناراضی در آئی۔

وہ خاموشی سے جھکیں اور اپنے قدموں میں گرا ہوا
 نکاح نامہ اٹھایا اور صدمے بھرے انداز سے چلتی ہوئی
 ٹرنک کے پاس آکر رک گئیں۔ انہوں نے آس پاس
 گری ہوئی چیزیں خاموشی سے اٹھائیں اور صندوق
 میں ڈال دیں۔ اس کے بعد پاس رکھا ہوا تالا اٹھا کر
 صندوق کو لگایا اور جس خاموشی سے اندر داخل ہوئی
 تھیں، اسی طرح اسٹور سے نکل گئیں۔ عدینہ اور مونا
 کا بس نہیں چل رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما
 جائیں۔

”عدینہ باجی! اب کیا ہوگا؟“ مونا کی آنکھوں میں یہ
 پریشان کن سوال ابھرا۔

”کچھ نہیں ہوتا۔“ عدینہ کا اپنا دل اندیشوں سے
 بھرا ہوا تھا لیکن اس نے پھر بھی مونا کو تسلی دی۔

”میرا خیال ہے ہمیں آپا کی کھوج سے باہر نکل آنا
 چاہیے۔“ اپنے کمرے میں آتے ہی مونا نے اپنے
 خیالات کا اظہار بے فکری سے کیا۔ عدینہ نے اس کی
 بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا، اس کا ذہن ابھی تک
 اس نکاح نامے میں الجھا ہوا تھا۔ وہ بار بار سوچ رہی
 تھی کہ کاش اس نے اسے ایک نظر دیکھ لیا ہوتا۔ اس
 واقعے کے بعد عدینہ اور آپا صالحہ کے درمیان ایک دفعہ
 پھر اجنبیت کی خلیج حائل ہو گئی تھی۔ آپا صالحہ نے
 ایک دفعہ پھر اسے مخاطب کرنا چھوڑ دیا تھا۔ جب کہ
 عدینہ کچھ دن تو پریشان رہی اور پھر سر جھٹک کر قرآن
 پاک حفظ کرنے میں مگن ہو گئی، جس دن اس کی حتم
 القرآن کی تقریب تھی، اس سے اگلے دن اس کا
 میڈیکل کا دوبارہ اسے انٹری ٹیسٹ تھا۔

”آپا! میرے لیے دعا کیجیے گا۔“ دو مہینے کے بعد
 عدینہ نے ڈرتے ڈرتے ان سے کہا۔

”اچھا۔“ آپا نے ایک لفظ میں قصہ نبٹایا۔
 ”آپ مجھ سے خفا ہیں ناں؟“ عدینہ نے اس دن
 ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

”تم سے خفا نہیں ہوں عدینہ! لیکن تم نے میرا
 بہت دل دکھایا ہے۔“ ان کا رنجیدہ انداز عدینہ کا دل

جاؤ۔" انٹری ٹیسٹ والے دن آپا صالحہ نے عجیب سی فرمائش کی۔

"وہ کیوں آیا؟"

"میں تمہیں ان کے مخصوص یونیفارم میں دیکھنا چاہتی ہوں۔" ان کے لہجے میں ہزاروں حسرتیں پنہاں تھیں۔

"آپ کو خاکی رنگ کی ساڑھی اچھی لگتی ہے کیا؟" عدینہ مسکرائی۔ آرمی میڈیکل کالج کی طالبات کا ساڑھی مخصوص یونیفارم تھا۔

"ہاں۔ اس یونیفارم نے بہت دن تک کسی کی نیندیں اڑائے رکھی تھیں، مجھے ان نیندوں کا قرض اتارنا ہے۔" وہ بیچ سے ٹیک لگا کر افسردگی سے گویا ہوئیں۔

"آپا، انشاء اللہ میں وہاں کا ٹیسٹ بھی ضرور دوں گی۔" عدینہ نے آپا سے سوال جواب کرنا چھوڑ دیے تھے۔ اس کی تسلی پر ایک مبہم سی مسکراہٹ آپا

صالحہ کے ہونٹوں پر آئی اور پھر معدوم ہو گئی۔



وہ جون کی ایک تپتی دھوپ تھی جب سورج، آسمان سے آگ برسا رہا تھا۔ چرند پرند ہر کوئی اپنے اپنے ٹھکانے میں دھکا ہوا تھا۔ ڈاکٹر حماد کے پورشن میں آج صبح سے ہر چیز پر سوگواریت طاری تھی کیونکہ آج بینش کی والدہ کی پانچویں برسی تھی۔ بینش اپنی والدہ کی تصویر ہاتھ میں پکڑے افسردگی کا اشتہار بنی ہوئی تھی، جب آغا جی نے اس کے کمرے میں جھانکا۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ صبح سے خاصی رنجیدہ ہے اور وقفے وقفے سے رونے کا سلسلہ بھی جاری تھا، لیکن آغا جی اس معاملے میں بالکل بے بس تھے کیونکہ انہیں اندازہ تھا کہ بینش اپنی والدہ کی کمی شدت سے محسوس کرتی ہے۔

"بیا، ذرا باہر آؤ بیٹا، دیکھو تو کون آیا ہے۔" انہوں نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور سنجیدگی سے بینش کو پکارا۔

"مجھے صرف ایک بات کا جواب دے دیں۔"

عدینہ نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔

"ہاں پوچھو،" وہ مطمئن تھیں۔

"میرا باپ کون تھا؟"

"مولوی رفیق احمد۔" آپا صالحہ کے حلق سے ایک پرسکون سانس خارج ہوئی۔ "بس یہی پوچھنا تھا؟"

"ہاں۔" عدینہ اب اطمینان بھرے انداز میں کھڑی ہو گئی، اسے اب واقعی ان سے کوئی سوال نہیں کرنا تھا۔ اسے اس سوال کے بعد اپنی ماں کے ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ "آپ فرید چچا سے کہہ دیں کہ کل مجھے بس پر بٹھا دیں۔؟"

"میں خود چلوں گی تمہارے ساتھ ٹیسٹ دلوانے۔"

آپا صالحہ کی بات پر وہ بری طرح چونکی۔ "آپ؟"

"ہاں، میں۔" آپا صالحہ نے پراعتماد انداز میں جواب دیا۔

"چلیں ٹھیک ہے۔" عدینہ نے سنجیدگی سے سر ہلایا اور اپنے کمرے کی طرف برہم آئی۔

"افوہ عدینہ باجی! اس کتبے کے بارے میں تو پوچھتیں۔" مونانے اسے دیکھتے ہی جھنجھلا کر کہا۔

"میں اپنی وجہ سے آپا کو کسی مشکل یا اذیت میں نہیں ڈالنا چاہتی موننا۔ بہتر ہو گا کہ تم بھی ان ساری باتوں کو بھلا دو۔" عدینہ کی صاف گوئی موننا کو اچھی نہیں لگی۔

"کم از کم یہ تجسس تو ختم ہو جاتا۔" موننا برا سامنہ بنا کر بولی۔

"مجھے اب کوئی سسپینس نہیں رہا، تم بھی اب صرف اپنی اسٹڈی کی طرف توجہ دو۔" عدینہ نے سنجیدہ انداز میں موننا کو مشورہ دیا تو وہ بس سر ہلا کر رہ گئی کیونکہ اسے علم تھا کہ اب عدینہ کے ساتھ بحث کرنا فضول ہے، کیونکہ وہ جس بات کا ارادہ کر لیتی تھی، پھر اس پر ڈٹ جاتی تھی۔

"میرا دل چاہتا ہے کہ تم آرمی میڈیکل کالج میں

نے ان کے ساتھ بیٹھی اس بے وقوف کو دیکھا، جس کی شہابی رنگت، سیاہ لان کے عام سے سوٹ میں بھی دمک رہی تھی۔ بڑی بڑی غزالی آنکھیں اور ہونٹوں کا خوب صورت کٹاؤ اور ہونٹ کے اوپر دائیں طرف ایک چھوٹا سا تل تھا۔ وہ اچھی خاصی حسین لڑکی تھی۔

”بندیا اب تمہارے ساتھ ہی رہے گی۔“ آغا جی کی بات پر بینش کی آنکھوں میں حیرانی در آئی۔

”وہ کیسے؟“ بینش کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”وہ اس طرح کہ اس نالائق کا یہاں کالج میں ایڈمیشن کروانا ہے۔“ منشی چچا نے ہلکے پھلکے انداز میں بتایا۔

”بینش! تم بندیا بیٹی کو اپنے کمرے میں لے جاؤ۔“ آغا جی کے کہنے پر وہ اسے لے کر اپنے کمرے میں آگئی۔

”تمہاری امی نے تمہیں آنے کی اجازت دے دی؟“ بینش نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پہلا سوال کیا۔

”ولیس“ انہوں نے تو باقاعدہ شکرانے کے نقل ادا کیے تھے۔

”بندیا کا بے تکلف انداز بینش کو اچھا لگا۔

”وہ کیوں بھلا؟“ اس نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

”ان کی پانچویں بیٹیوں میں میں سب سے نکمی کام چور، پھوڑ اور ست جو تھی۔“ بندیا نے اپنی خامیاں بڑے فخریہ انداز میں اس طرح سے بتائیں کہ بینش کو ہنسی آگئی، جبکہ بندیا بڑے مزے سے اس کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”بابا، مجھے بھجوانے کے حق میں نہیں تھے لیکن ڈاکٹر صاحب اور اماں کے کہنے پر مان ہی گئے۔“ وہ اب بڑے آرام سے اپنی چوٹی کے بل کھول رہی تھی۔

”کیا آغا جی نے منشی چچا سے کہا تھا۔“ بینش کی سمجھ میں آگیا تھا۔

”جی۔۔۔ وہ بتا رہے تھے کہ آپ اپنی والدہ کی وفات کے بعد بہت تنہائی محسوس کرتی ہیں۔“ بندیا کی بات پر

”آغا جی! میرا دل نہیں کر رہا ہے۔“ وہ حد درجہ سوگوار تھی اور کچھ صبح صبح اس کی اپنے منگیتر تیمور سے بھی ہلکی سی جھڑپ ہو گئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس لڑائی کے بعد بھی اسے شدت سے اپنے اکلوتے ہونے کا احساس ہوا تھا۔ دوسرے پورشن میں اس کے تایا کی فیملی تھی اور تایا کی دو بیٹیاں، ڈبیری، طیبہ اور اکلوتا بیٹا تیمور تھا۔ وہ تینوں کسی بھی لڑائی کے موقع پر متحد ہو جاتے اور بینش کو اکیلا چھوڑ دیتے۔

”تم ہمیشہ اپنے اکلوتے ہونے کا گلہ کرتی تھیں ناں۔“ آغا جی کی بات پر وہ ہلکا سا چونکی۔

”دیکھو میں نے تمہاری تنہائی دور کرنے کے لیے کسے بلوایا ہے۔“ او میرے ساتھ۔“ آغا جی کی بات پر وہ بادل خواستہ اٹھی۔

”آغا جی! آخر کون آیا ہے؟“ بینش کا اس وقت کسی سے بھی ملنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

”تم دیکھو گی تو پتا چل جائے گا۔“ آغا جی مسکراتے ہوئے اس کے ساتھ لاؤنج میں داخل ہوئے، بینش کو

اندر داخل ہوتے ہی خوشگوار حیرت ہوئی۔ سامنے ان کی زمینوں کا حساب کتاب کرنے والے منشی چچا بیٹھے تھے، ان کے ساتھ بینش کی ہم عمر ایک دلکش خدوخال کی حامل لڑکی بیٹھی تھی جس کے چہرے پر اسے دیکھتے ہی ایک دوستانہ مسکراہٹ ابھری۔

”یہ بندیا ہے تمہارے منشی چچا کی منجھلی بیٹی۔“ آغا جی نے مسکرا کر اس لڑکی کا تعارف کروایا۔

”السلام علیکم۔“ بینش نے سنجیدگی سے سلام کیا تو اس لڑکی کی بڑی بڑی آنکھوں میں چمک در آئی۔ وہ بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”ماشاء اللہ! میٹا رانی تو خوب بڑی ہو گئیں۔“ منشی چچا نے اٹھ کر بینش کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”الحمد للہ! میڈیکل کے پہلے سال میں ہے۔“ آغا جی نے فخریہ لہجے میں اطلاع دی۔

”تو بیٹا اس بے وقوف کو بھی کچھ عقل دو، مرمر کر ایف اے کیا ہے اس نے۔“ منشی چچا کی بات پر بینش

وہ افسردہ ہوئی۔

”بس بابا نے جب میری گریجویشن کا ذکر کیا تھا تو آپ کے والد نے فوراً کہا کہ میں ہوسٹل کے بجائے ان کے گھر رہ لوں۔“ بندیا نے تفصیلاً بتایا۔

”ہیئر برش ہو گا آپ کے پاس۔“ اس کی اگلی فرمائش پر بینش حیران رہ گئی۔

”اصل میں گرمی سے بال گردن سے چپک کر رہ گئے ہیں، بہت الجھن ہو رہی ہے مجھے۔“ بینش نے آرام سے اٹھ کر اسے ہیئر برش پکڑا دیا، وہ اب بڑے لا پروا انداز سے اپنے بال کھول رہی تھی جبکہ بینش کی توصیفی نگاہیں اس کے سلکی ریشمی بالوں پر جمی ہوئی تھیں۔

”کیا لگاتی ہو تم اپنے بالوں میں۔“ بینش کے لمبے میں تجسس محسوس کر کے بندیا مسکرائی اور اس نے بینش کی طرف غور سے دیکھا، اس کے اپنے بال خاصے ہلکے اور بمشکل کندھوں تک ہی آتے تھے۔

”میں کہاں لگاتی ہوں، سارے اماں کے ہی شوق ہیں، ہر ہفتے آئل، ریٹھا، سیکا کائی بھگو کر ساری بہنوں کو زبردستی لگاتی تھیں۔“ بندیا بے زاری سے اپنے بالوں

میں برش کرتے ہوئے بینش کی معلومات میں اضافہ کر رہی تھی۔

”آپ اتنے بڑے گھر میں اکیلی کیسے رہ لیتی ہیں؟“ بندیا نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے حیرت سے دریافت کیا۔

”اکیلی تو نہیں ہوں، ساتھ والے پورشن میں میرے تایا کی فیملی رہتی ہے۔“ بینش نے لا پرواہی سے کہا۔

”لیکن آپ کا پورشن بھی تو اچھا خاصا بڑا ہے، اس میں تو آپ تنہا ہی رہتی ہوں گی۔“ بندیا نے اس کی دکھتی رگ کو چھیڑا۔

”ظاہر ہے کہ میں آغا جی کی اکلوتی بیٹی جو ہوں۔“ بینش کے لمبے میں ایک محسوس کی جانے والی افسردگی در آئی۔

”ہائے کتنا مزہ آتا ہو گا آپ کو۔“ بندیا کے حسرت بھرے انداز پر وہ حیران ہوئی۔ ”اپنی مرضی سے سارے کام کرتی ہوں گی، نہ کوئی روک ٹوک، نہ کوئی پابندی۔ ہمارے گھر میں تو اماں ہر وقت کسی جیلر کی طرح ہم سب بہنوں پر نظر رکھتی ہیں، مجال ہے بندہ کوئی کام اپنی مرضی سے کر لے۔“ بندیا کے اپنے ہی خود ساختہ دکھ تھے۔

”لیکن میں تو اکیلی رہ کر بہت بور ہوتی ہوں، اصل میں میری اپنی تایا زاد کزنز سے کوئی خاص دوستی نہیں۔“ بینش نے منہ بنا کر اسے بتایا۔

”چلیں اب تو میں آگئی ہوں، دونوں بہنیں مل کر موجیں کریں گے۔“ بندیا کے منہ سے نکلنے والے لفظ ”بہن“ پر بینش کو خوش گوار سا جھٹکا لگا۔ اس نے بندیا کو کھلے دل سے اس گھر میں خوش آمدید کہا اور شام کو وہ اسے اپنی فخریہ پیش کش کے طور پر اپنے ساتھ لے کر بڑے ابا کے ہاں پہنچ گئی۔



”ارے یہ اتنی خوب صورت لڑکی کون ہے بیا کے ساتھ۔“ ڈیزی آپلی نے نی وی لاؤنج کی گلاس وال سے دیکھا۔ وہ لان میں بندیا کے ساتھ کھڑی کسی بات پر بے ساختہ ہنس رہی تھی۔ اس وقت وہ تینوں بہن بھائی اپنی والدہ کے ساتھ نی وی لاؤنج میں تھے۔ جہاں سے باہر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔

”اس کے ساتھ تو جو بھی کھڑی ہوگی خوب صورت ہی لگے گی۔“ بڑی اماں نے گھریلو سامان کی لسٹ بناتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ انہیں اپنے میاں کی عام سی شکل و صورت کی حامل بیٹی سے اچھی خاصی چڑھائی تھی، کچھ ان کے اپنے تینوں بچے گورے چٹے اور خوب صورت نقوش کے حامل تھے۔ ان تینوں میں تو بینش واقعی بہت عام سی لگتی تھی لیکن اس عام سی شکل و صورت کے ساتھ بھی اس نے سب کو اپنے آگے لگا رکھا تھا۔

”می! آہستہ بولیں، بینش نے سن لیا تو جا کر ابا سے

”اور مجھے تو خون دیکھ کر ہی ابکائی آنے لگتی ہے۔“
ڈیزی نے بھی عجیب سی شکل بنائی۔
”اسی لیے تو وہ بھی پر فدا ہیں، وہ ان کا خواب جو
پورا کر رہی ہے۔“ بڑی اماں نے بے زاری سے کہا۔
”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں اماں! میرا تو مکمل
ارادہ ہے میڈیکل میں جانے کا۔“ طیبہ نے پر جوش
انداز میں انہیں یاد دلایا۔

”ہاں۔۔۔ اسی لیے تو تمہاری کچھ سن لیتے ہیں وہ۔“
”میری طرف تو دیکھتے ہی ان کے ماتھے کی تیوریوں
میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔“ تیمور افسردہ ہوا۔
”تم نے بھی تو پورے دو سال انہیں دھوکا دیا، وہ
سمجھتے رہے کہ تم ایف ایس سی پری میڈیکل میں ہو
اور تم کالج میں اکناکس، مہتھس اور اسٹینٹس پڑھتے
رہے۔“ ڈیزی نے ہنستے ہوئے یاد دلایا۔

”اور جس دن پتا چلا تھا انہیں، یاد ہے کتنا بڑا طوفان
آیا تھا۔“ سی اے کا اسٹوڈنٹ تیمور اس دن کا واقعہ یاد
کر کے مسکرایا۔

”میرے اتنے مہنگے فرانس کے ڈنر سیٹ کی پوری
چار پلیٹیں توڑی تھیں انہوں نے، مجھ سے پوچھو۔“ ان
کی اماں جل کر بولیں۔

”اماں اتنے سال ہو گئے اور آپ کو ابھی تک وہ ڈنر

سیٹ نہیں بھولا۔“ ڈیزی کھلکھلا کر ہنسی تو اماں کو
اس موقع پر اس کی ہنسی زہر لگی۔

”ظاہر ہے میرے جینز کا ڈنر سیٹ تھا وہ، کیسے بھولتا
مجھے۔ میرے والد فرانس سے خرید کر لائے تھے۔“
اماں کے لہجے میں رنجیدگی دور آئی۔

”اماں پلیز۔۔۔ آپ چھوڑیں ان پلیٹوں کو، آپ ابا
سے بات کریں نا، میرا ایڈمیشن کروادیں ایم ایس سی
کیمسٹری میں۔“ ڈیزی فوراً ہی ان کے پاس آن
بیٹھی۔

”نا بلانا۔۔۔ اپنی جنگ خود لڑو، وہ تو پہلے ہی کہتے ہیں
کہ میں نے سارے بچوں کی بے جا طرف داری
کر کے انہیں بگاڑ رکھا ہے۔“ انہوں نے صاف انکار

شکایت لگا دے گی۔“ طیبہ نے اپنے جرنل سے نظریں
ہٹا کر پریشان لہجے میں کہا۔ وہ ویسے بھی تینوں بہن
بھائیوں میں خاصی ڈرپوک تھی۔

”تمہارے باپ کی تو چیمٹی ہے۔ سارا دن تم لوگوں
کی جھوٹی چچی شکایتیں جو لگاتی ہے۔“ بڑی اماں نے
ناک چڑھا کر اپنی لسٹ پر نظر دوڑائی۔

”آپ لوگوں کے ساتھ پر اہم کیا ہے، کیوں اس
کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔“ تیمور جو اسپورٹس چینل
پر نظریں جمائے بیٹھا تھا ایک دم چڑ کر بولا۔

”دیکھ لیں امی، جب سے اس کی منگنی ہوئی ہے نا
اس بیا سے زیادہ ہی طرف داری کرنے لگا ہے اس
کی۔“ ڈیزی نے جھٹ سے ماں سے شکایت لگائی۔

”میں کوئی طرف داری نہیں کر رہا لیکن اس طرح
کسی کی کم صورتی کا مذاق تھوڑی اڑاتے ہیں۔“ بڑی
بہن کے سامنے وہ اکثر دھیمہ پڑ جاتا۔

”تمہیں خود بھی کون سا بنیش پسند ہے، صرف
بڑے ابا کے کہنے پر ہی تو منگنی کی ہے۔“ ڈیزی نے
اسے یاد دلایا۔

”تو اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ میں اس کی
شکل و صورت اور رنگت کا مذاق اڑانے لگوں۔“ تیمور
نے بے زاری سے کہا۔

”اس کی بد صورتی کی وجہ سے نہیں، اس کے مزاج
کی وجہ سے چڑتے ہیں ہم۔ یاد نہیں ابا کو کیسے جا جا کر
بھڑکائی ہے ہمارے خلاف۔“ ڈیزی نے یاد دلایا۔

”اور وہ بھی صرف اسی کی مانتے ہیں۔“ طیبہ نے
بھی لقمہ دیا۔

”ظاہر ہے تم تینوں نے تو اپنے باپ کو اچھا خاصا
مایوس کیا ہے، کتنا شوق تھا انہیں اپنی ساری اولاد کو ڈاکٹر
بنانے کا۔“ بڑی اماں کو بھی اپنی اولاد کی نالا لہتی یاد
آگئی۔

”بھئی مجھے تو سخت نفرت ہے میڈیکل سے۔“
تیمور نے نی وی کا چینل تبدیل کرتے ہوئے اپنی رائے
کا اظہار کیا۔

کیا۔

”اوہ اچھا۔۔۔“ بڑی اماں کا تجسس دور ہوا تو انہوں نے دونوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
”کیا نام بتایا تم نے ان کا؟“ تیمور کو شرارت سو جھی۔

”بندیا۔۔۔“ بینش نے مسکرا کر جواب دیا۔
”کیا بندریا۔۔۔؟“ تیمور نے شرارتی نظروں سے بندیا کو دیکھا، جس کا شہابی چہرہ ایک لمحے کو سرخ ہوا۔ وہ اپنی بڑی بڑی غزالی آنکھوں کو مزید پھیلا کر ناراضی سے تیمور کو دیکھ رہی تھی۔
”بندریا نہیں، بندیا۔۔۔“ بینش نے جھنجھلا کر تصحیح کی۔

”بھائی۔۔۔ وہ بندیا جو لڑکیاں ماتھے پر لگاتی ہیں۔“ طیبہ نے وضاحت کی تو تیمور کے لبوں پر ایک شوخ سی مسکراہٹ ٹھہر گئی۔
”کتنے دن کے لیے آئی ہے؟“ بڑی اماں نے معلومات میں اضافے کے لیے پوچھا۔
”جب تک اس کی گریجویشن نہیں ہو جاتی۔“ بینش آج خاصی خوش تھی۔

”چلو اچھا ہوا، تمہاری بھی تنہائی دور ہوئی، ورنہ سارا دن بولائی گھومتی ہو۔“ بڑی اماں نے دل ہی دل میں سکون کا سانس لیا۔
ڈیزی نے بوا رحمت کو چائے لانے کا اشارہ کیا اور

خود کسی بہانے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔
اس کی بینش سے بالکل نہیں بنتی تھی، دونوں ایف ایس سی میں کلاس فیلو تھیں لیکن بینش کے میڈیکل میں جانے کے بعد بابا اس سے خفا ہو گئے تھے اور انہوں نے پورے دو ماہ ڈیزی سے بات نہیں کی تھی اور اس کا ڈیزی کو بہت دکھ تھا اور کچھ بینش ہر تیسرے دن اپنے تایا ابا کو شہرہ دلانے پہنچ جاتی اور اپنی میڈیکل کے شعبے کے واقعات سنا سنا کر وہ ان کی محرومیوں کو جگا دیتی جس کے نتیجے میں وہ تیمور اور ڈیزی کو خواہ مخواہ ہی اٹھتے بیٹھتے ڈانٹنے لگتے۔

”میری دونوں کزنز مجھ سے سخت جھلس رہی ہیں۔“

”مجھ سے تو پچھلے دو سال سے خفا ہیں کہ میں نے اپنا میرٹ کیوں نہیں بنایا ایف ایس سی میں؟“ ڈیزی نے منہ بنایا۔

”حالانکہ انہیں پتا نہیں، میرٹ سے کم نمبر لینے کے لیے تم نے کتنی محنت کی تھی۔“ تیمور نے اپنے سے ایک سال بڑی بہن کو چھیڑا۔ دونوں میں خاصی بے تکلفی تھی۔

”قسم سے بیس بیس نمبر کے سوال چھوڑ کر آتی رہی ہوں پرچے میں۔“ ڈیزی منہ پر ہاتھ رکھ کر شرارت سے ہنسی۔

”شرم تو نہیں آتی باپ کو دھوکا دیتے ہوئے۔“ اماں کو غصہ آگیا۔

”تو کیا کرتی، سارا پر چا حل کر کے آتی تو آرام سے میرٹ بن جاتا۔“ ڈیزی کو اپنے کارنامے پر ذرا بھی شرمندگی نہیں تھی۔

”چلو باپ تو خوش ہو جاتا، سب سے بڑی اولاد سے کتنی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں والدین کی۔“ اماں کے رنجیدہ انداز پر ایک لمحے کو ڈیزی بھی خفت کا شکار ہوئی لیکن اگلے ہی لمحے وہ لاؤنج کے دروازے کی طرف متوجہ ہو گئی جہاں بینش اس کیوٹ سی لڑکی کے ساتھ اندر آچکی تھی۔

”السلام علیکم تائی اماں۔۔۔“ بیابانے بندیا کا ہاتھ پکڑ کر بڑے جوش بھرے انداز سے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام۔۔۔ بھئی یہ کون ہے؟“ بڑی اماں نے پاس رکھا اپنا چشمہ لگا کر پہچاننے کی کوشش کی۔

”یوں سمجھیں، چھوٹی بہن ہے میری۔“ اس نے جتاتے ہوئے انداز سے ڈیزی کی طرف دیکھا جو طیبہ کے جرنل برداشتہ جھکی ہوئی تھی۔ دونوں بہنوں میں تین سال کا فرق تھا لیکن کمال کی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔
”پھر بھی کچھ پتا تو چلے۔“ بڑی اماں سے تجسس برداشت نہیں ہو پا رہا تھا۔

”اپنی زمینوں کے منشی چچا غلام صابر کی بیٹی ہے بندیا۔“ بینش نے جھٹ سے بتایا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
 - ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
 - ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
 - ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
 - ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
 - ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
 - ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
 - ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
 - ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
 - ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
 - ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
 - ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
 - ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

بڑی اماں کے پورشن سے نکلتے ہوئے بینش نے سرگوشی میں اسے بتایا۔
”لیکن کیوں۔ آپ تو بہت اچھی ہیں۔“ بندیا کو حیرانی ہوئی۔

”اصل میں دونوں بہنیں میری طرح ذہین جو نہیں ہیں اور پھر تیا ابا کو اپنے سارے بچوں میں سے سب سے زیادہ پیار جو مجھ سے ہے۔“ بینش کے لہجے میں خود پسندی کا عنصر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

”ان کا بھائی تو مجھے بہت بد تمیز سالک رہا تھا۔“ بندیا کو اچانک یاد آیا تو اس کی بات پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”نہیں۔۔۔ نہیں تیمور بالکل بھی ایسا نہیں ہے۔“ بینش نے فوراً تردید کی۔ ”ہاں۔۔۔ کچھ شرارتی سا ہے۔“ بندیا نے چونک کر تیمور کے نام پر بینش کے چہرے پر اترتی دھنک کو محسوس کیا اور خاموش رہ گئی۔ اگلے دن بینش کے کلج جانے کے بعد وہ تنہا تھی اور لان میں ایک بھورے کے تعاقب میں وہ تیمور کے لان کی طرف نکل آئی۔

”ہائے بندیا کیسی ہو۔؟“ وہ جامن کے درخت سے چھلانگ لگا کر اچانک اترتا تو وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

”آپ نے کل مجھے بندیا کیوں کہا تھا؟“ بندیا کو اچانک ہی یاد آیا تو وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر اپنی چھوٹی سی ناک چڑھا کر بولی تو تیمور کو ہنسی آگئی۔

”آپ مجھے پاگل سمجھ رہے ہیں کیا؟“ وہ بری طرح تلملا اٹھی۔

”نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ میری یہ جرات۔۔۔“ تیمور نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”کسی کا نام بگاڑنے سے پہلے اگر بندہ یہ سوچ لے کہ اگر اس کا نام بگڑ جائے تو اسے کیسا لگے۔“ وہ جل کر بولی۔

”اچھا تو تم بھی بگاڑ لو میرا نام۔“ اس نے ہنستے ہوئے بندیا کو مزید چڑایا۔

”ہو نہ۔۔۔ تیمور لنگ۔۔۔“ بندیا کے منہ سے بے ساختہ پھسلا تو اس نے دلچسپ نگاہوں سے اس لڑکی کو دیکھا جس کی غزالی آنکھوں میں ہلکی سی ناراضی جھلک رہی تھی اور غصے کی زیادتی سے اس کے گل تپ کر کشمیری سیب لگ رہے تھے۔

”تیمور لنگ کے بارے میں کیا جانتی ہو؟“ وہ اسے چڑانے کے لیے مسکرا کر بولا۔

”میں، سٹری کی پروفیسر نہیں ہوں جو لیکچر دینا شروع کر دوں۔“ اس نے اپنی نالا لٹھی کو چھپانے کے لیے الفاظ کا سہارا لیا۔

”تمہیں پتا ہے چودھویں صدی میں سلطنت عثمانیہ اور بغداد و دمشق کے حکمرانوں کے لیے امیر تیمور کو جنگ میں شکست دینا تو مشکل تھا لیکن اس کے لنگڑے پن کا مذاق اڑانا زیادہ آسان تھا اور اسی لیے وہ اسے تیمور لنگ کہتے تھے۔“ اس کی تاریخی معلومات قابل رشک تھیں۔

”تو۔۔۔ تم خود کو امیر تیمور سمجھتے ہو۔“ بندیا نے مسکراتی نگاہوں سے اس ہینڈ سم لڑکے کو دیکھا جو پہلی ہی نظر میں اس کے دل کے سومنات کو ڈھا گیا تھا۔

”میرا نام تیمور جلال الدین ہے اور میں خود کو یہی سمجھتا ہوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے اس کے دل کی دنیا میں تلاطم برپا کر گیا۔ بندیا غلام صابر کو لگا جیسے وقت ٹھہم گیا ہو اور اس کی دھڑکنیں جمود کا شکار ہو گئی ہوں۔ وہ ایک دم گھبرا کر اپنے جوتے کی نوک سے لان کی مٹی

کریدنے لگی۔ تیمور نے بہت دلچسپی سے اس کے بوکھلائے ہوئے روپ کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے اندر کی طرف چل دیا۔

Downloaded From

pakociety.com

”کیا۔۔۔“ بینش کا تعجب سے منہ کھلا اور بند ہوتا بھول گیا۔

”اوریدا کی بورڈ میں تیسری پوزیشن ہے۔“ بینش کے ہاتھ سے اسٹرابریز سے بھرا باؤل گرتے گرتے بچا۔

وہ سخت حیرت اور بے یقینی سے آغا جی کی طرف دیکھ رہی تھی جو بڑے ابا کے گھر سے آکر یہ نیوز بریک کر رہے تھے۔

”آپ اور یداتیمور کی بات کر رہے ہیں نا۔“ بینش نے ہاتھ میں پکڑا باول ڈانگنگ ٹیبل پر رکھا اور گھر میں داخل ہوتے ارصم نے اور یداکا نام بقا مٹی ہوش و حواس سنا تھا۔ وہ ایک لمحے کو دروازے میں ہی رک گیا۔

”ہاں نا۔ میں تیمور کی بیٹی کی بات کر رہا ہوں۔“ آغا جی نے دانستہ اپنے لہجے کو ہلکا پھلکا رکھا اور باول سے اسٹرابری نکال کر کھانے لگے۔

”تیسری پوزیشن یا تھرڈ ڈویژن۔“ بینش کو اپنی سماعتوں پر شک گزرا۔

”افوہ بیٹا! کیا ہو گیا ہے“ تیسری پوزیشن کی بات کر رہا ہوں میں۔“ آغا جی کے دہرانے پر بھی بینش کو یقین نہیں آیا۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“ ان کے منہ سے پھسلا۔

”لو ارصم آگیا۔ بے شک اس سے پوچھ لو۔“ آغا جی کی نظر دروازے میں کھڑے ارصم پر پڑی جس نے بوکھلاہٹ میں اپنی ماں اور نانا دونوں کو مشترکہ سلام کیا۔

”کس چیز کی بات کر رہے ہیں آپ۔“ ارصم سمجھنے سے قاصر تھا۔

”اور یداکا کی بورڈ میں تیسری پوزیشن آئی ہے تمہیں تو اس نے فون کر کے سب سے پہلے بتایا ہوگا۔“ آغا جی کے منہ سے نکلنے والے اس بے ساختہ

فقرے نے بینش کے چہرے کو تاریک کیا اور اسی لمحے آغا جی کو بھی احساس ہوا کہ وہ خاصا غلط بول گئے ہیں۔

”نہیں آغا جی۔ مجھے تو نہیں بتایا اس نے۔“ ارصم کو خوش گوار حیرت کا جھٹکا لگا لیکن اس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔

”کیا۔۔۔ واقعی۔۔۔“ اس دفعہ حیران ہونے کی باری آغا جی کی تھی۔ ”ہو سکتا ہے کوئی سرپرائز کا چکر ہو۔“ انہوں نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔

”کب آیا رزلٹ۔“ ارصم نے اپنا لہجہ میں حتی

الامکان سرسری رکھتے ہوئے پوچھا۔

”کل۔۔۔“ آغا جی نے اسے مزید تعجب میں مبتلا کیا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس نے تمہیں نہ بتایا ہو۔“ بینش نے اپنا غصہ ارصم پر اتارنے کی کوشش کی۔

”تو آپ کا کیا خیال ہے“ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔“ خلاف توقع بینش کو ارصم کی بات کا یقین آ ہی گیا۔

”ہونہ۔۔۔ تیسری پوزیشن لے کر دماغ تو عرش پر پہنچ گیا ہوگا اور یداکا۔“ بینش نے بے زاری سے اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ ”اور یہ بھی ممکن ہے باپ نے بورڈ میں پیسے دے کر نمبر لگوا لیے ہوں۔“ بینش اور یداکا کی طرف سے ہمیشہ بدگمان ہی رہتی تھیں۔

”خیر یہ پیسوں والا چکر تو میں نہیں مان سکتا۔“ آغا جی نے فوراً ”ان کے الزام کی تردید کی۔“ ”ہاں اتنا پتا ہے مجھے کہ اس نے محنت خوب کی تھی۔“

”خاک محنت کی ہوگی ماں کی طرح دماغ میں بھوسا بھرا ہوا ہے اس کے یاد نہیں اس کی ماں بی اے میں کتنے برے طریقے سے فیل ہوئی تھی۔“ بینش نے زخموں کے ٹانگے ایک ساتھ ادھیڑے۔

”ہزار دفعہ سمجھایا ہے بینش! ماضی کی باتوں کو بار بار مسترد ہرایا کرو۔“ آغا جی ہلکا سا برا مان گئے۔

”انسان چاہ کر بھی اپنے ماضی سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ تلخ یادیں دل دکھاتے لمحے اور اپنوں کے دیے گئے فریب، کسی آسیب کی طرح انسان کا تعاقب کرتے

ہیں اور ماضی کے یہ بھوت کبھی کبھی حال کی خوشیوں کے ساتھ چمٹ کر انہیں تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔“ بینش کا چہرہ تاریک ہوا۔

”لیکن تم نے تو ایک بات کے پیچھے اپنی ساری ہی زندگی خراب کر ڈالی۔“ آغا جی افسردہ ہوئے۔

”آغا جی! میں ذرا بڑے ابا سے مل کر آتا ہوں۔“ ارصم کو اس افسردہ ماحول سے وحشت ہوئی۔

”ہونہ صاف کہو نا کہ مبارک باد دینے جاتا ہے اس شہزادی کو۔“ بینش اچھا خاصا چڑ گئیں۔

پھپھو کے چہرے پر ایک لطف لیتی ہوئی مسکراہٹ تھی۔

”ایسی، ایسی“ اسے تو مرگی کا دورہ پڑ گیا ہوگا۔ تمہارے آغا جی نے اب تک جا کر بتا ہی دیا ہوگا۔“ بڑی اماں آج بہت خوش تھیں۔

”یہ تم کہاں جا رہی ہو اور یہاں۔“ طیبہ نے چونک کر اوریدا کی طرف دیکھا، وہ اچانک ہی افسردہ نظر آنے لگی تھی۔

”کہیں نہیں پھپھو! لان میں۔“ انہی بات کہہ کر وہ رکی نہیں اور لاؤنج سے نکل گئی۔ ارصم کا دل دکھانا اسے تاسف میں مبتلا کر گیا تھا۔

”مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔“ وہ خود سے لڑتے ہوئے لان میں اپنے پسندیدہ گوشے کی طرف نکل آئی۔ ”ایسا کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا میں نے“ اس دفعہ کب ارصم نے مجھے بڑھایا تھا۔“ اس نے خود کو مطمئن کرنے کی ناکام کوشش کی۔

”انسان کم از کم دو حرف مبارک باد کے ہی دے دیتا ہے۔“ وہ لان چیر پر اکیلی بیٹھی خود سے الجھ رہی تھی اور اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب سرمد اس کے سامنے رکھی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔

”کیا سوچ رہی ہو اوریدا؟“ سرمد کی آنکھوں میں چمکتے جگنو اوریدا کو الجھن میں مبتلا کرنے لگے۔ ”کچھ نہیں۔“ وہ سنجیدہ انداز سے بولتی ہوئی سرمد کو کچھ بریشان سی لگی۔ ”تمہیں اپنی پوزیشن کی خوشی نہیں ہوئی کیا؟“

”ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ اوریدا نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔

”اچھا یہ تو تمہارا گفت۔“ سرمد نے مسکراتے ہوئے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک معمولی ڈبیا نکال کر اوریدا کی طرف بڑھائی۔

”یہ کیا ہے؟“ اوریدا حیران ہوئی۔ ”کھول کر دیکھو گی تو پتا چلے گا نا۔“ اوریدا نے ہلکا سا جھجک کر ڈبیا کھولی تو سامنے ایک نازک اور اشائش سا برسلٹ دیکھ کر اس کی آنکھیں

”تو ماما! اس میں حرج ہی کیا ہے۔“ ارصم نے پُر سکون انداز سے ان کا ناراض چہرہ دیکھا، وہ ابھی تک اس جھٹکے سے باہر نہیں نکلی تھیں۔

”تم نے تو قسم کھا رکھی ہے اپنی ماں کا دل جلانے کی۔“ وہ پاؤں پٹختی ہوئی لاؤنج سے نکل گئیں۔ ”ان کو کیا ہوا؟“ ارصم نے نا سمجھی سے آغا جی کی طرف دیکھا۔

”تم جاؤ، کل تک خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔“ آغا جی نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

بنیش کا دل جلا کر جب وہ بڑے ابا کے ہاں پہنچا تو اسے علم نہیں تھا کہ یہاں اس کا بھی دل جلانے کا پورا سامان موجود ہے۔ اوریدا کی پھپھو طیبہ بڑی سی مٹھائی کی ٹوکری، کیک اور پھلوں کے ساتھ وہاں موجود تھیں۔ سرمد اور ماہیر دونوں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اوریدا ان سب کو کیک سرو کر رہی تھی۔ جیسے ہی وہ لاؤنج میں داخل ہوا، سب سے پہلے ماہیر کی اس پر نظر پڑی۔

”آؤ بھئی ارصم! دیکھو تمہاری تالائق اسٹوڈنٹ نے کیا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔“ ماہیر نے خوش گوار لہجے میں اسے اطلاع دی۔

”اس دفعہ مجھے ارصم نے نہیں بڑھایا۔“ اوریدا نے کیک کو نفاست سے کاٹتے ہوئے تردید کی۔ ارصم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، جس کے چہرے پر اجنبیت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ارصم کو چھن سے اپنے اندر کچھ ٹوٹا ہوا محسوس ہوا۔

”میں بڑے ابا سے مل کر آتا ہوں۔“ وہ ایک دم سے اٹھا اور بڑے ابا کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ماہیر اور سرمد نے حیرانی سے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔

”لو! اس نے تو مبارک باد تک نہیں دی۔“ بڑی اماں بُرا مان گئیں۔

”دے دے گا اماں! اتنی جلدی بھی کیا ہے۔“ ماہیر نے لاپرواہی سے کہہ کر کیک کا ٹکڑا اٹھا کر اپنے منہ میں ڈالا۔

”بنیش کی تورات کی نیند حرام ہو گئی ہوگی۔“ طیبہ

جگمگا اٹھیں۔ ”واؤ۔۔۔ امیزنگ۔۔۔“
 ”تمہیں اچھا لگا؟“ سرمد کے بے تاب انداز پر وہ
 ٹھٹھکی اور اگلے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا۔
 ”ہاں اچھا ہے۔“ اس نے دانستہ سنجیدہ انداز
 اپنایا۔

”تھمنکس گاڈ! تمہیں پسند آگیا“ یقین مانو میں
 نے اور شانزے نے بہت مشکلوں سے چوز کیا تھا۔“ وہ
 مزے سے اسے بتا رہا تھا۔
 ”کیسی ہے شانزے؟ آپ اسے دوبارہ نہیں لے کر
 آئے۔“ اوریدانے موضوع گفتگو تبدیل کیا۔
 ”بہت اچھی ہے، کسی دن لے کر آؤں گا اسے۔“
 سرمد نے مسکراتے ہوئے اسے تسلی دی۔ اسی وقت
 گھر کا داخلی دروازہ کھلا اور ارصم باہر نکلا۔ وہ ان دونوں
 کو دیکھ کر ٹھٹھکا اور اگلے ہی لمحے وہ سر جھٹک کر اپنے
 پورشن کی طرف بڑھ گیا۔

”تمہاری ارصم کے ساتھ کوئی لڑائی ہے کیا؟“ سرمد
 نے ارصم کی طرف دیکھتے ہوئے الجھن بھرے انداز
 میں پوچھا۔
 ”نہیں تو۔“ اوریدانے ہلکا سا گھبرا کر جواب دیا۔
 ”آپ کو کس نے کہا؟“

”پتا نہیں کیوں مجھے ایسا فیل ہوا۔ ایک جھوٹیلی اس
 نے تمہاری کامیابی پر کوئی رسپانس جو نہیں دیا۔“ سرمد
 کی بات پر اوریدانے سنجیدہ تو ہوئی لیکن سرمد کے سامنے
 اس بات کا اظہار کچھ مناسب نہیں تھا۔
 ”ایسا کچھ نہیں ہے، وہ مجھے فون پر مبارکباد دے

چکا تھا۔“ اوریدانے جھوٹ بولا، جسے سن کر کم از کم
 سرمد کو ہلکی سی مایوسی ہوئی۔
 ”تب ہی۔“ وہ زبردستی مسکرایا تو اوریدانے پر سکون
 ہو گئی۔

”میرے ساتھ ڈنر پر چلو گی، تم سے کچھ خاص بات
 کرنی ہے۔“ سرمد کی اگلی بات نے اوریدانے کا سکون
 غارت کیا۔

”ڈنر پر۔“ وہ ہلکا سا گڑبڑائی۔ ”ماہیر بھائی سے
 پوچھا آپ نے؟“

”میں ماہیر کی نہیں، تمہاری اور اپنی بات کر رہا
 ہوں۔“ سرمد کا پُر اعتماد انداز اوریدانے کو الجھن میں مبتلا
 کر رہا تھا۔
 ”بڑی اماں سے پوچھوں گی۔“ اوریدانے اسے
 ٹالنے کی کوشش کی۔

”ان سے میں پوچھ چکا ہوں۔“ سرمد کا آج ہوم
 ورک مکمل تھا۔ وہ ہر طرف سے اسے گھیرنے کی
 کوشش میں تھا۔ اس وقت وہ دونوں ہاتھ سینے پر
 باندھے اسے ٹھٹھکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں
 میں مچلتے جذبے اوریدانے کو پریشان کر رہے تھے۔
 ”مجھے نہیں۔ کچھ دن بعد چلیں گے۔“ وہ سرمد کو
 مایوس کر کے اندر کی جانب بڑھ گئی۔ سرمد کا چہرہ تاریک
 ہوا اور وہ مایوسی کے عالم میں وہیں بیٹھا رہ گیا۔



”کھانا کیوں نہیں کھا رہے ہو تم۔؟“ بینش نے اس
 کے کمرے میں جھانکا، وہ جو لشن سینے پر رکھے یا سیت
 کے عالم میں بے نام سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے
 چونک کر بینش کا چہرہ دیکھا، لگتا تھا وہ خود کو سنبھال چکی
 تھیں، اس لیے ان کا چہرہ کچھ پُر سکون تھا۔
 ”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ ارصم ان کے احترام
 میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”پانچ دن کے بعد تم گھر آتے ہو اور تب بھی
 ڈھنگ سے کھانا نہیں کھاتے۔“ وہ اس کی بیڈ شیٹ کی
 نادیدہ سلوٹوں کو دور کرنے لگیں۔

”پتا نہیں کیوں آج کل بھوک نہیں لگتی مجھے۔“
 ارصم نے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ
 مزید پریشان ہو گئیں۔

”تم بڑے ابا سے کہہ کر کوئی میڈیسن لوٹا، معدہ تو
 ڈسٹرب نہیں ہے تمہارا۔“ وہ بالکل اس کے سامنے
 آن کھڑی ہوئیں۔

”معدہ نہیں، میری تو ساری زندگی ہی ڈسٹرب ہو گئی
 ہے۔“ وہ چاہتے ہوئے بھی یہ جملہ ان کے سامنے
 نہیں کہہ سکتا تھا۔

الگ لیکن اس کے باوجود آغا جی اور ارصم دونوں ہی اسے ٹوکنے سے باز نہیں آتے تھے۔
”میں نے غلط تھوڑی کہا ہے، دیکھ لیجئے گا میڈیکل کے پہلے ہی سال میں لڑھک جائے گی۔“ بینش نے ان کے اعتراض کو دانستہ نظر انداز کرتے ہوئے تبصرہ کیا۔

”بیٹا! آج کل تمہاری آسٹرالوجی (علم نجوم) کچھ زیادہ اچھی نہیں جا رہی، اس لیے مستقبل کی پیش گوئیاں کرنے سے پرہیز ہی کرو تو بہتر ہے۔“ آغا جی کا دلچسپ انداز بینش کو سلا گا گیا۔

”ضروری نہیں کہ میرے سارے اندازے غلط ہوں۔“

”اور یہ بھی ضروری نہیں کہ تمہارے سارے اندازے درست ہوں۔“ آغا جی نے کھانا کھاتے ہوئے ان کا مزید دل جلایا۔

”تم ڈھنگ سے کھا کیوں نہیں رہے؟“ انہوں نے حسب عادت اپنی جھنجلاہٹ ارصم پر اتارنے کی کوشش کی۔ آغا جی کو تو وہ کچھ کہہ نہیں سکتی تھیں۔ لیکن ارصم ان کے لحاظ میں اکثر چپ ہی رہتا۔

”میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ مجھے بھوک نہیں ہے۔“ وہ ناراض انداز سے اٹھا، ڈانگنگ میز کی کرسی پیچھے کی اور کمرے سے نکل گیا۔

”مجھے ایک سو ایک فیصد یقین ہے، وہ اوریدا آج کل اسے لفٹ نہیں کروا رہی، تب ہی اتنا اکتایا ہوا پھر رہا ہے۔“ ارصم نے ڈانگنگ ہال سے نکلتے ہوئے

بینش کا یہ تلخ جملہ سنا اور ایک لمحے کو اس کے قدم ساکت ہوئے۔

”ارصم اور اوریدا کی کبھی لڑائی ہو ہی نہیں سکتی۔“ آغا جی نے مسکرا کر بینش کو جواب دیا۔

”ارے خود غرض ماں کی بیٹی ہے وہ اپنا مطلب نکال کر آنکھیں ماتھے پر رکھنا خوب جانتی ہے۔“ بینش کا استہزائیہ انداز ارصم کا دل جلا کر خاک کر گیا۔ وہ ناراضی سے اپنے کمرے کی طرف برہم گیا۔

”یہ تم اچھا نہیں کر رہی ہو اوریدا!“ ارصم نے بیڈ

”چھا ڈانگنگ ٹیبل پہ چلو، تھوڑا بہت چکھ لینا۔“ بینش کے چہرے پر پھیلی پریشانی کو محسوس کر کے اس نے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی سے ان کے ساتھ اٹھ کر ڈانگنگ ہال میں آگیا، جہاں آغا جی پہلے سے موجود تھے۔

”کس میڈیکل کالج میں ایڈمیشن لے رہی ہے اوریدا۔“ آغا جی نے سلاؤ کی پلیٹ اٹھاتے ہوئے سرسری پوچھا۔

”آغا جی! کھانے کی میز پر یہ باتیں کرنا ضروری ہے کیا۔“ بینش جھنجلا گئیں۔

”میں نے تو یوں ہی پوچھا تھا۔“ وہ ہلکی سی خفت کا شکار ہوئے اور ارصم کو ان کا شرمندہ ہونا اچھا نہیں لگا۔ ”آغا جی! میں نے اس سے پوچھا نہیں۔“ ارصم نے سنجیدگی سے جواب دیتے ہوئے اپنی پلیٹ میں کھیرے کے چند ٹکڑے ڈالے۔

”یہ فٹ چکھو، میں نے خود تمہاری لیے فرائی کی ہے۔“ بینش نے مچھلی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر زبردستی ارصم کی پلیٹ میں ڈالا۔

”تم کچھ ڈسٹرب لگ رہے ہو بیٹا۔“ آغا جی نے غور سے اپنے نواسے کا چہرہ دیکھا۔

”ایسا کچھ نہیں ہے آغا جی! کچھ تھکا ہوا ہوں، اس لیے آپ کو ایسا محسوس ہو رہا ہے۔“ ارصم نے بینش کی کھوجھتی نگاہوں سے گھبرا کر نہ چاہتے ہوئے بھی تھوڑے سے فرائیڈ رائس اپنی پلیٹ میں نکالے۔

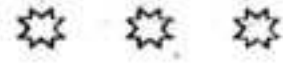
”میڈیکل کی تعلیم بھی تو آسان نہیں ہے، یہ تو اب

پتا چلے گا تیمور کی صاحب زادی کو۔“ بینش نے ناگواری سے لقمہ دیا۔

”بھئی! یہ اچھی زبردستی ہے، ہم لوگوں پر اس موضوع پر گفتگو کرنے پر بین ہے اور تم جب چاہو اظہار خیال کرنے لگتی ہو۔“

آغا جی کے منہ بنانے پر ارصم پھیکے سے انداز سے مسکرایا، اتنا تو اسے بھی علم تھا کہ بیس دو سروں پر بہت زیادہ حاوی ہونے والی شخصیت کی حامل تھیں اور ان کے اپنے لیے اصول الگ تھے اور دو سروں کے لیے

پر رکھا کٹن غصے سے زمین پر مارا۔ اس کے اندر اشتعال کی ایک لہر نمودار ہوئی وہ بری طرح سے تپ چکا تھا۔ بنیش کی باتوں نے اس کے پورے وجود کو سلگا کر رکھ دیا تھا۔



”جب میں کہہ رہا ہوں کہ میں خود تمہارے لیے ایک ایڈ بناؤں گا“ تمہیں میری بات کا یقین کیوں نہیں آ رہا۔“ ماہیر نے ناراض نظروں سے سامنے بیٹھی شانزے کو دیکھا جس کا دماغ ابھی بھی یادِ صاحب کے لان کے اشتہار میں انکا ہوا تھا۔

”آپ سچ کہہ رہے ہیں۔“ شانزے کو یقین نہیں آیا۔

”نہیں جھوٹ بول رہا ہوں۔“ وہ جھنجلا گیا۔
”کب بنائیں گے؟“ شانز اس کے موڈ سے بے پروا اپنی ہی ہانک رہی تھی۔

”ابھی چلتے ہیں سیٹ لگواؤں کیا؟“ ماہیر کے طنزیہ انداز پر وہ ہلکا سا چونکی اور مدھم سی شرمندگی کی لہر اس کے چہرے پر نمودار ہوئی۔

”میں تو ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔“ شانزے نے خفت زدہ انداز میں کہا۔

”میں بھی بائی داوے ہی تمہیں بتا رہا ہوں۔“ ماہیر کا غصہ ابھی بھی کم نہیں ہوا تھا۔

”آپ ہر وقت مجھے ڈانٹتے ہی کیوں رہتے ہیں۔“ شانزے کی بے نیازی پر نہ چاہتے ہوئے بھی ماہیر کو ہنسی آگئی اور وہ پھیل کر بیٹھ گئی۔

”تم اگلے بندے کو آخری حد تک زچ جو کر دیتی ہو۔“ ماہیر نے سائیڈ میز پر رکھے پانی کے جگ سے گلاس بھر اور فوراً ہی پی گیا۔

”آپ کو علم نہیں ہے میں اس شوق کے ہاتھوں کتنا خوار ہوئی ہوں۔“ شانزے نے منہ بنایا۔

”جو چیز آپ کو تھکا دے اور خواری کے سوا کچھ نہ دے اس کا نہ کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔“ ماہیر نے اس نادان لڑکی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”بس پہلی اور آخری دفعہ اسکرین پر آؤں گی۔“ شانزے کی بات پر وہ حیران ہوا۔
”اچھا ٹھیک ہے اس کاغذ پر لکھ کر دو۔“ ماہیر کو شرارت سو جھی۔

”کیا۔۔۔“ اس نے تعجب سے ماہیر کو دیکھا جو ایک خالی کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اسے دلچسپ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

”یہی کہ تم پہلا اور آخری ایڈ کرو گی۔“

”اس سے کیا ہو گا؟“ شانزے کو اس کی پراسرلو مسکراہٹ کے پیچھے چھپی منطق سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

”میں کل ہی ایک بسکٹ کے اشتہار کا شوٹ

اشارت کروا دوں گا“ اس کا پیپر ورک مکمل ہے۔“ ماہیر کی بات پر وہ پرجوش ہوئی۔

”ارے کیا واقعی؟“ اس نے جلدی سے خالی کاغذ پر چند لائن تیزی سے تحریر کیں اور نیچے اپنے سائن کر دیے۔

”اب اپنی بات پر قائم رہنا شانزے۔“ ماہیر نے انگلی اٹھا کر اسے وارننگ دی۔

”بے فکر رہیں۔ ایسا ہی ہو گا۔“ شانزے پر اعتماد تھی۔

”چاہے کوئی کتنی بھی اچھی آفر کرے۔“ ماہیر نے جانچتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”چاہے کوئی دس کروڑ کی ہی آفر کیوں نہ کرے۔“ وہ بھی مزے سے بولتی ہوئی ماہیر کو حیران کر گئی۔

”اوکے ڈن۔“ ماہیر نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ

اس کی جانب بڑھایا۔ جسے شانزے نے بغیر سوچے سمجھے تھام لیا۔ اگلے ہی لمحے وہ اس کے ہاتھ کی مضبوطی سے بوکھلا گئی۔ وہ شرارتی نظروں سے اسے دیکھتا ہوا

اچھا خاصا پزل کر گیا تھا۔



وہ تینوں بہن بھائی شرمندگی سے سر جھکائے بڑے ابا کے اسٹڈی روم میں ان کے سامنے کھڑے تھے۔

نے انہیں یاد دلانے کی کوشش کی۔

”ہو نہس۔۔۔ یہ بھی تو ان ہی کی بہن ہے، ان ہی کے نقش قدم پر چلے گی۔“ آج تو وہ طیبہ سے بھی مایوس دکھائی دے رہے تھے۔ طیبہ کا رنگ زرد ہوا۔

”تم لوگ جاؤ، بوا رحمت نے کھانا لگا دیا ہے۔“ بڑی اماں کی اس بات پر تینوں نے ممنون نگاہوں سے اپنی ماں کی طرف دیکھا، جو اکثر ہی ان کی ڈھال بن جاتی تھیں۔ ان تینوں کے باہر نکلتے ہی بینش کو اچھی خاصی مایوسی ہوئی، اس کا سارا مزہ کر کر اہو گیا۔

”بڑے ابا! میں بھی چلتی ہوں، آغا جی آگئے ہوں گے۔“ بینش اکتاہٹ بھرے انداز سے کھڑی ہوئی۔

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ بیٹا کیوں نہیں، میری طرف سے حماد کو مبارک باد دینا، خوش قسمت ہے وہ جس کی ایک ہی اولاد ہے اور وہ بھی اتنی لائق۔“ بڑے ابا کی بات پر ان کی بیگم نے بے چینی سے پہلو بدلا، لیکن بینش کو اس دفعہ ان کے اس فقرے نے وہ لطف نہیں دیا تھا جو کچھ دیر پہلے اپنے کزنز کی درگت بنتے دیکھ کر اسے حاصل ہوا تھا۔

”یہ اپنا رزلٹ کارڈ بھی لے جاؤ۔“ بڑی اماں نے پیچھے سے اسے کوفت بھرے انداز سے پکارا۔ انہیں پتا تھا جتنی دیر یہ رزلٹ کارڈ ان کے میاں کے سامنے رہے گا، ان کا مزاج یوں ہی برا رہے گا۔



”میرا بس نہیں چلنا کہ میں اس بیا کی بچی کو جامن

کے درخت پر الٹا لٹکا دوں۔“ ڈیزی لان میں ٹہل ٹہل کر اپنا غصہ تم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دونوں بہنیں وہاں موجود تھیں جبکہ تیمور غصے سے گھر سے باہر نکل گیا تھا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے ایسا کر کے ملتا کیا ہے۔“ آج تو طیبہ کو بھی اپنی اس کزن پر شدید غصہ آ رہا تھا۔

”شروع سے فسادی طبیعت پائی ہے اس نے۔“ ڈیزی نے منہ بنا کر اپنی بہن کو یاد دلایا۔

بڑے ابا کے ہاتھ میں ان کے پروفیشن سے متعلق ایک بھاری سی۔۔۔ کتاب تھی اور چہرے پر ہلکی سی برہمی صاف چھلک رہی تھی۔ ان کے برابر میں بینش گردن اکڑائے بڑے غرور سے بیٹھی ان تینوں کا دل جلا رہی تھی۔ بینش کے انگ انگ سے خود پسندی جھلک رہی تھی۔

”تم تینوں نے تو مجھے مایوس کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔“ وہ ناراض انداز سے گویا ہوئے۔ ڈیزی اور تیمور کے سر مزید جھک گئے۔

”یہ بھی تو تم لوگوں کی بہن ہے، رزلٹ دیکھا ہے تم لوگوں نے اس کا۔“ بڑے ابا نے بینش کا رزلٹ کارڈ ان کے سامنے لہرایا۔

”صبح سے یہی تو دیکھ رہے ہیں۔“ بڑی اماں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ناگواری سے کہا۔

”لیکن عقل پھر بھی نہیں آئی ہوگی تمہاری اولاد کو۔“ انہوں نے ہاتھ میں پکڑی کتاب غصے سے میز پر پٹنی۔

”یہ بینش کا میڈیکل کارڈ ہے جبکہ تیمور اور ڈیزی میں سے کوئی بھی میڈیکل کا اسٹوڈنٹ نہیں۔“ بڑی اماں نے انہیں یاد دلایا۔

”تو اپنے سب جیکٹس میں کون سے انہوں نے تیر مار لیے ہیں۔“ انہوں نے طنزیہ انداز سے اپنے بچوں کی طرف دیکھا۔

”سب بچوں کا ذہن ایک جیسا تھوڑی ہوتا ہے۔“ انہوں نے قدرے محتاط انداز اپنایا، ویسے بھی بینش

کے چہرے پر دلی دلی سی مسکراہٹ ان کو تپا رہی تھی۔ لیکن اس وقت اسے کچھ کہنا، بڑے ابا کے جلال کو آواز دینے کے مترادف تھا۔

”کتنا شوق تھا مجھے، میرا اکلوتا بیٹا میڈیکل میں آئے اور یہ دو جمع دو بائیس کرنے چل پڑا۔ ساری عمر اکاؤنٹس کی گتیاں سلجھاتے ہوئے گزر جائے گی اس کی۔“ بڑے ابا ایک دفعہ پھر ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے۔

”طیبہ پڑھ تو رہی ہے بری میڈیکل۔“ بڑی اماں

”تو کیا آپ کے بڑے ابا کو اپنے بچوں سے پیار نہیں۔۔۔“ بندیا کے منہ سے پھسلا۔

”نہیں۔۔۔ ان کو سب سے زیادہ محبت مجھ سے ہے۔“ بینش نے اتر کر جواب دیا تو بندیا الجھ سی گئی۔

”میں نے بڑے ابا کی وہ ساری امیدیں پوری کی ہیں جو انہیں اپنی اولاد سے تھیں۔“ بینش نے وضاحت کی۔

”لیکن ان کے بچے بھی تو اچھے خاصے لائق ہیں کیا ہوا جو وہ میڈیکل میں نہیں گئے۔“ اس نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔

”بڑے ابا میڈیکل کے علاوہ کسی فیلڈ کو اہم نہیں گردانتے۔“ بینش نے مسکراتے ہوئے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”لو ان کے کہنے سے باقی پروفیشن غیر اہم تھوڑی ہو جائیں گے۔“ بندیا کو ان کی منطق بالکل پسند نہیں آئی۔

”تم چھوڑو انہیں یہ بتاؤ کالج کفارم فل کر لیا۔“ اسے بندیا کی بحث پسند نہیں آرہی تھی اس لیے اس نے موضوع ہی بدل دیا۔

”ہاں بہت آسان مضامین رکھے ہیں میں نے۔۔۔“ بندیا نے اسے تفصیل سے بتانا شروع کیا۔

ان دونوں کے درمیان اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی لیکن بندیا کو چند ہی دنوں میں اندازہ ہو گیا تھا کہ بینش کے ساتھ گزارا کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ وہ حد

درجہ مغرور اور ضدی تھی۔ ذہانت کی دولت سے مالا مال تھی لیکن اپنے سامنے کسی کو کچھ بھی نہیں گردانتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی اپنی فرسٹ کزنز میں سے کسی سے بھی نہیں بنتی تھی اور ان کے ساتھ مقابلہ بازی کا میدان بھی اکثر سجا ہی رہتا۔ جس میں جیت بھی ہمیشہ بینش کی ہی ہوتی تھی۔



بخاور اور ہاشم کا اس کے دوست کے گھر میں استقبال خاصی خوش دلی سے ہوا تھا۔ ہاشم کا یہ دوست

”ہاں بچپن میں بھی ہماری جھوٹی شکایتیں لگا کر بابا سے ڈانٹ پڑواتی تھی۔“ طیبہ نے مزید اضافہ کیا۔

”بتایا تو ہے کہ یہ فطرتاً خود غرض جھوٹی اور مکار لڑکی ہے۔“ ڈیزی کا غصہ کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

”اور سے تیمور بھائی نے اس کے ساتھ منگنی کر لی ہے۔“ طیبہ کو اچانک یاد آیا۔

”اس بے چارے نے تو بابا کو خوش کرنے کے چکر میں یہ کڑوا گھونٹ پیا تھا مگر افسوس۔“ ڈیزی نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”ابا پھر بھی خوش نہیں ہوئے۔“ طیبہ کے لہجے میں رنجیدگی در آئی۔

”وہ تو ساری زندگی ہی ہم سے خوش نہیں ہوں گے۔“ ڈیزی کو آج بابا کے رویے سے بہت مایوسی ہوئی تھی۔

”ہاں۔۔۔ ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں آپ۔۔۔“ طیبہ نے بھی تاسف بھرے انداز میں کہا۔ وہ دونوں بہنیں لان کی گھاس پر بیٹھ گئیں۔ دونوں کا ہی غصہ کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ دوسری طرف بینش اپنے گھر میں پہنچ کر بندیا کے سامنے قہقہے لگا رہی تھی اور وہ حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”یقیناً بانو ان تینوں بہن بھائیوں کی شکلیں دیکھ کر مجھے بہت ہنسی آرہی تھی۔“ بینش نے اپنا کارنامہ کھل کر بتایا۔

”لیکن یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔“ بندیا کو اس کی

یہ حرکت بالکل بھی اچھی نہیں لگی۔

”تمہیں نہیں معلوم تینوں مل کر کیسے میرا دل جلاتے رہے ہیں۔“ بینش نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی صفائی دی۔

”کیا وہ بھی آغا جی سے آپ کو ایسے ہی ڈانٹ پڑواتے ہیں۔“ بندیا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”آغا جی کیوں مجھے ان کے کہنے پر ڈانٹیں گے بھلا۔۔۔“ بینش کو اس کی بات پسند نہیں آئی۔ ”وہ تو مجھ سے پیار کرتے ہیں ظاہر ہے میں ان کی اکلوتی اولاد جو ہوئی۔“

خاصا خوش حال تھا اور ماڈل ٹاؤن میں بنی اس کی کوٹھی اور اس کا رہن سہن اس بات کا ثبوت تھا۔ ان دونوں کے لیے گیسٹ روم میں اینج منٹ کر دیا گیا تھا۔ ہاشم کے دوست کی بیوی فائزہ خاصی دوستانہ مزاج کی حامل ایک ہنس مکھ لڑکی تھی اس کی شادی کو دو سال ہوئے تھے اور ان کا ایک کیوٹ سا بیٹا تھا۔

”ان دونوں کی بھی لو میرج ہے۔“ ہاشم نے اپنے کمرے میں آکر اسے بتایا تو وہ حیران رہ گئی۔

”فائزہ کے گھر والے مان گئے تھے کیا؟“ بختاور نے غجالت بھرے انداز میں پوچھا۔

”یہاں معاملہ الٹ تھا“ فائزہ کے گھر والے تو مان گئے تھے لیکن سرفراز کے گھر والے اس کی شادی فیملی میں کرنا چاہتے تھے۔“ ہاشم نے مسکرا کر جواب دیا۔

”تو پھر ان دونوں کی شادی کیسے ہوئی۔۔۔؟“

سرفراز نے کسی نہ کسی طرح اپنے گھر والوں کو منا ہی لیا، پورے تین سال لگے تھے اسے۔“ ہاشم نے اپنی کیس کھول کر اپنا نائٹ ڈریس نکالا۔ ”بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی ان دونوں کی شادی۔“

”اچھا۔۔۔“ بختاور کو نہ جانے کیوں سن کر مایوسی ہوئی۔

”تمہارا منہ کیوں لٹک گیا۔۔۔؟“ ہاشم اس کا مزاج آشنا تھا۔

”میں سوچ رہی ہوں کہ کاش ہم لوگ بھی تھوڑا انتظار کر لیتے تو شاید۔۔۔“ بختاور نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔

”میں تو ساری زندگی انتظار کر سکتا تھا لیکن تمہارے پیرٹس کبھی نہ کرتے، بھول گئیں کہ ہمارا نکاح کن حالات میں ہوا تھا۔“ ہاشم نے اس کا پازو پکڑ کر بیڈ پر بیٹھایا۔ وہ خاصی دل گرفتہ سی لگ رہی تھی۔

”ہاں اب تک تو میری فیصل کے ساتھ رخصتی بھی ہو چکی ہوتی۔۔۔“ بختاور جلد ہی حقیقت کی دنیا میں آگئی۔

”جی جناب اور آپ اس وقت میرے ساتھ نہیں بلکہ فیصل صاحب کے ساتھ ہوتیں۔“ ہاشم نے اسے چھیڑا۔

”اللہ نہ کرے۔۔۔“ بختاور نے بے ساختہ اس کے لبوں پر ہاتھ رکھے تو وہ مسکرا دیا۔

”تم کسی دن بیٹھ کر ضروری چیزوں کی لسٹ بنالیتا، جن کی ہمیں فوری طور پر اپنے گھر میں ضرورت پڑے گی۔“ ہاشم نے واش روم کی طرف بڑھتے ہوئے لاپرواہی سے کہا اور بختاور اپنے گھر جانے کے معاملے میں اتنی پر جوش ہوئی کہ اس نے آؤدہ کھانہ تاؤ اور ہاشم کے واش روم میں جاتے ہی اپنی ڈائری اٹھائی اور لسٹ بنانا شروع کر دی۔

”ارے، یہ تم ڈائری میں کیا لکھ رہی ہو؟“ ہاشم ٹراؤزر اور ٹی شرٹ پہن کر باہر نکلا تو اسے بڑی توجہ سے ڈائری پر جھکے دیکھ کر حیران ہوا۔

”گھریلو سامان کی لسٹ بنا رہی ہوں۔“ اس نے سر اٹھائے بغیر جواب دیا۔

”اچھا، دکھاؤ تو سہی۔۔۔“ وہ مسکراتا ہوا بیڈ پر اس کے برابر آن بیٹھا اور لسٹ میں پہلی ہی لائن پڑھ کر اسے جھٹکا سا لگا۔

”کیا ہوا۔۔۔؟“ بختاور نے اس کا چو نکنا فوراً محسوس کیا۔

”یہ ضروری اشیاء کی لسٹ ہے کیا۔۔۔؟“ ہاشم نے حیرانی سے بختاور کا سادہ اور ریا سے پاک چہرہ دیکھا۔

”ہاں ناں۔۔۔“ اس نے کمال بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔

”اے سی، ٹی وی، فریج، مائیکرو ویو اوون، ٹوسٹر، سینڈوچ میکر، واشنگ مشین، بیڈ، صوفہ، ڈائننگ ٹیبل۔۔۔“ ہاشم بلند آواز میں پڑھتے ہوئے رکا۔

”کیا ہوا؟ رک کیوں گئے۔۔۔؟“ بختاور پریشان ہوئی۔

”یہ ساری ضروری اشیاء کیا تمہیں ابھی چاہئیں؟“ ہاشم سنجیدہ ہوا۔

”ہاں ناں، ان کے بغیر کیسے گزارا ہو سکتا ہے۔“ بختاور کو اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔

”کچھ اندازہ ہے کہ ان سب چیزوں پر کتنا پیسہ خرچ ہو گا۔“ ہاشم نے محتاط انداز میں پوچھا تو اس نے نفی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
 - ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
 - ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
 - ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
 - ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
 - ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
 - ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
 - ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
 - ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
 - ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
 - ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
 - ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
 - ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ڈائری کا وہ صفحہ اس کے سامنے کیا اب اس لسٹ میں واشنگ مشین اور استری کے علاوہ سب چیزیں کٹ چکی تھیں۔

”واشنگ مشین ضروری ہے کیا۔۔۔؟“ ہاشم نے کچھ لمحے سوچ کر جھک کر پوچھا۔

”مجھے ہاتھ سے کپڑے دھونے نہیں آتے۔۔۔“ بختاور نے اس طرح شرمندگی سے اعتراف کیا جیسے کوئی مجرم کمرۂ عدالت میں اپنے جرم کا اعتراف کرتا ہے۔ ہاشم اس کی سادگی پر مسکرایا۔ اس نے غور سے بختاور کے دودھیا سپید رنگت والے نرم و نازک ہاتھوں کو دیکھا اور بے اختیار تھام لیا۔ اس کے ہاتھوں کی نرمی اس چیز کی گواہ تھی کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔

”آئی ایم سوری یار۔۔۔“ اب شرمندہ ہونے کی باری ہاشم کی تھی۔ بختاور خاموش رہی وہ جانتی تھی کہ وہ کس پس منظر میں اس سے معذرت کا خواہاں ہے۔ ان دونوں کے درمیان ایک محسوس کی جانے والی خاموشی کا وقعہ آگیا تھا۔ دونوں کو ہی احساس ہو رہا تھا کہ زمانے کی تلخ حقیقتیں ان کی محبت سے زیادہ طاقت رکھتی تھیں اور وہ دونوں نہ چاہتے ہوئے بھی ان سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکتے تھے۔



عدینہ کی اس دفعہ میڈیکل کے انٹری ٹیسٹ میں دوسری پوزیشن بھی اور اس نے اسے اگلے دو دن تک

افسردہ رکھا تھا۔ آرمی میڈیکل کالج کی لسٹ میں اس کا نام آچکا تھا اور اسے نہ جانے کیوں خوشی نہیں ہو رہی تھی، البتہ آیا صالحہ بہت خوش تھیں۔ دونوں کے درمیان تعلقات ایک دفعہ پھر نارمل ہو گئے تھے۔ عدینہ اپنا نام میرٹ لسٹ میں دیکھتے ہی آیا صالحہ کے ساتھ فیس جمع کروانے پہنچ گئی۔ وہ ان کے ساتھ ایڈمن بلاک سے باہر نکلی تو سامنے سے آتے ارصم سے ٹکراتے ٹکراتے بچی وہ اسے دیکھ کر چونکا اور اگلے ہی لمحے خوش گوار حیرت کا شکار ہوا۔

”آپ۔۔۔؟ یہاں۔۔۔“ ارصم کے منہ سے بے

میں سر ہلا دیا۔
”لاکھوں لگ سکتے ہیں اور میرے اکاؤنٹ میں صرف پچیس ہزار روپے ہیں۔“ ہاشم کی بات نے بختاور کو پریشان کیا۔

”پھر ہم کیا کریں گے۔۔۔؟“
”صبر۔“ ہاشم نے مسکرا کر جواب دیا۔
”لیکن۔۔۔؟“ بختاور کے چہرے پر تفکر کے رنگ نمایاں ہوئے۔

”دیکھو بختاور! تم جتنی جلدی یہ بات بھول جاؤ گی کہ تم کس باپ کی بیٹی تھیں اور اب کس شخص کی بیوی ہو، تمہاری زندگی آسان ہو جائے گی۔“ ہاشم نے صاف گوئی سے اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔
”میں آپ کی بات سمجھی نہیں۔“ بختاور نے نا سمجھ انداز سے اس کی طرف دیکھا۔

”بھئی صاف بات ہے کہ میں تمہارے بابا کی طرح کروڑ پتی نہیں ہوں، تم آئندہ جو بھی کام کرو تو یہ ذہن میں رکھنا کہ تمہارے شوہر کی آمدنی بہت محدود ہے۔“ ہاشم کی بات پر وہ خفت کا شکار ہوئی۔

”آئی ایم سوری۔۔۔“ اس نے سر جھکا کر کہا۔ وہ جس لائف اسٹائل کی علوی تھی اسے وہاں سے نکلنے میں ابھی کافی عرصہ درکار تھا۔ معاشی مسائل کیا ہوتے ہیں اور ان سے کس طرح سے نکلا جاتا ہے اس کی زندگی ان تجربوں سے نا آشنا تھی۔

”آپ کوئی جاب کیوں نہیں کر لیتے۔۔۔؟“ بختاور

نے ہلکا سا جھجک کر مشورہ دیا۔

”ظاہر ہے وہ تو کرنی پڑے گی، کیونکہ اس کے بغیر گزارہ نہیں۔۔۔“ ہاشم نے ایک سرو آہ بھر کر بختاور کا معصوم چہرہ دیکھا، اسے افسوس ہوا کہ وہ محبت کے اس کانٹوں بھرے سفر میں اسے اپنے ساتھ خوار کرنے کے لیے کیوں لے آیا۔ اس نے اس نظروں سے بختاور کی طرف دیکھا، جو اپنی بنائی ہوئی لسٹ میں سے اشیاء کو بے دردی سے کٹ رہی تھی، ہاشم کو یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کا دل کٹ کر ایک طرف پھینک رہا ہو۔

”اب دیکھیں۔۔۔“ بختاور نے افسردہ سے انداز سے

اختیار پھلا۔

”جی میرا ایڈیشن ہو گیا ہے یہاں۔“ عدینہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”دیری ٹاکس۔“ وہ ایک دم خوش ہوا۔

”کیسے ہو بیٹا؟“ آپا صالحہ کو نہ جانے کیوں اس سے اپنائیت سی محسوس ہوتی تھی۔

”فائن۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ ٹیسٹ تو کروالیے ہوں گے آپ نے کیا رپورٹس آئی تھیں؟ وہ بڑے موڈ بانہ انداز سے بولا۔

”انہوں نے میرے بار بار کہنے کے باوجود بھی ٹیسٹ نہیں کروائے۔“ عدینہ کے لہجے میں شکایت کا رنگ نمایاں تھا۔ وہ ایک دم تشویش میں مبتلا ہوا۔

”یہ تو بہت غلط بات ہے آنٹی! آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ اس کے لہجے میں موجود فکر مندی آپا صالحہ کو اچھی لگی۔

”ایسے ہی چھوٹا موٹا انفیکشن ہو گا بیٹا! خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔“ آپا صالحہ نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

”کیسی ڈاکٹر ہیں آپ؟ آپ کو زبردستی ان کے ٹیسٹ کروانے چاہیے تھے۔“ وہ اب عدینہ پر خفا ہوا۔

”ان کے ساتھ زبردستی نہیں کی جاسکتی۔“ عدینہ ہلکا سا مسکرائی۔

”آپ بھی اسی کالج میں پڑھتے ہیں۔“ آپا صالحہ نے اسے کیڈٹ یونیفارم میں دیکھ کر اندازہ لگایا۔

”جی آنٹی۔ آمیں ناں! آپ کو کیسے ٹیرا سے چائے

پلواتا ہوں۔“ اس کو آداب مہمانی کا خیال آیا۔

”نوبیٹا تھینک یو۔“ انہوں نے سنجیدگی سے کہہ کر عدینہ کو چلنے کا اشارہ کیا۔

”اوکے آر صم! ہم لوگ چلتے ہیں۔“ عدینہ نے الوداعی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

”ہیسٹ آف لک عدینہ! میں اسی کالج میں آپ کا سینئر ہوں، جب بھی کوئی پرابلم ہو، آپ مجھ سے کانٹیکٹ کر سکتی ہیں۔“ ار صم کی بات پر عدینہ نے سر ہلایا جبکہ آپا صالحہ ہلکی سی اضطرابی کیفیت کا شکار ہوئی۔ وہ ایڈمن بلاک کے اندر جا چکا تھا۔

”کوئی ضرورت نہیں اس سے رابطہ کرنے کی، لڑکیوں کو اپنے مسائل خود حل کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔“ اس کے جاتے ہی انہوں نے جھٹ سے نا پسندیدگی کا اظہار کیا تو عدینہ جھنجھلا سی گئی۔

”آپ کو اچھی طرح پتا ہے کہ میں اپنے کام خود کرنے کی عادی ہوں۔“

”مجھے معلوم ہے لیکن پھر بھی تمہیں سمجھانا میرا فرض ہے۔“ وہ دونوں آہستگی سے چلتے ہوئے گیٹ کی طرف برہم رہی تھیں۔

”آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے کیا۔؟“ عدینہ چلتے چلتے رکی۔

”تمہیں معلوم نہیں صنف مخالف کے پاس لڑکیوں کو متاثر کرنے کے کتنے ہتھکنڈے ہوتے ہیں اور لڑکیاں بے چاری نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے خوب صورت لفظوں کے ظلم میں گرفتار ہو جاتی ہیں۔“ آپا صالحہ کے لہجے میں کوئی ان کما دکھ بول رہا تھا۔

”میرا شمار ایسی لڑکیوں میں نہیں ہوتا، ویسے بھی میری زندگی میں اب کسی اور کی گنجائش نہیں بچتی۔“

عدینہ کی صاف گوئی آپا صالحہ کی بدکھتی رگ کو چھیڑ گئی۔

”ہزار دفعہ سمجھایا ہے کہ عبداللہ کو بھول جاؤ۔“ وہ ناراض ہوئیں۔

”اور لاکھ دفعہ میں نے بتایا ہے کہ یہ میرے اختیار میں نہیں۔“ وہ بھی تو ان ہی کی بیٹی تھی۔

”مجھے جب بھی کوئی اچھا رشتہ ملے گا، میں تمہاری شادی کروں گی۔“ انہوں نے آری میڈیکل کالج کے گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے عدینہ کو پریشان کیا۔

”آپ مجھے میڈیکل کی تعلیم کے دوران ڈسٹرب نہیں کریں گی۔“ عدینہ ضدی انداز میں سڑک پر کھڑی ہو گئی۔

”مجھے اپنی زندگی کا بھروسہ نہیں ہے بیٹا۔“ آپا صالحہ اب اس کی ضد کے سامنے ہار ماننے لگی تھیں۔

”مجھے اللہ کی ذات پر پورا یقین ہے، آپ کو کچھ نہیں ہو گا۔“ عدینہ نے پر اعتماد انداز میں کہا تو ایک

دھوپ سینک رہے تھے۔ جب کہ اوریدا نے اپنا لکڑی کا جھولا بھی باہر نکلوا رکھا تھا اور اس پر بیٹھی بڑے مزے سے مونگ پھلیاں کھا رہی تھی۔

”تمیز نہیں ہے تمہیں، یہ چھلکے زمین پر کیوں پھینک رہی ہو۔“ وہاں سے گزرتے ہوئے بڑی اماں کی نظر کچھ چھلکوں پر پڑی تو انہوں نے ناراضی سے گھور کر اوریدا کو دیکھا جو کسی سوچ میں گم تھی۔

”سوری بڑی اماں۔۔۔“ وہ اچھل کر کھڑی ہوئی اور بوکھلا کر زمین پر گرے مونگ پھلی کے چھلکے اٹھانے لگی۔

”اوریدا بی بی آپ رہنے دیں، میں اٹھا لیتی ہوں۔۔۔“ بوارحمت کی بہو غورا“ ہی اس کی مدد کو آئی۔

”السلام علیکم بڑی اماں! کیسی ہیں آپ۔۔۔“ ماہیر بڑی تیزی سے ہاتھ میں کچھ داخلہ فارم لیے وہاں پہنچا تھا، اچانک ہی اس کی نظر بڑے ابا پر پڑی۔ ”السلام علیکم بڑے ابا! کیسے ہیں۔“

”فائن۔۔۔“ انہوں نے اخبار سے سر اٹھائے بغیر سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

”لو بھئی اوریدا! تمہارے میڈیکل کالج کے فارم لے آیا ہوں۔ خیر سے تم نے دونوں کالجز کے ایڈمیشن ٹیسٹ پاس کر لیے ہیں۔“ ماہیر بہت خوش تھا۔

”اب کہاں ایڈمیشن لوگی تم؟“ وہ اس کے سامنے کھڑا بوجھ رہا تھا۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔“ وہ ارصم سے ناراضی کی وجہ سے آرمی میڈیکل کالج میں نہیں جانا چاہتی تھی۔

”میرا خیال ہے، راولپنڈی میڈیکل کالج میں لے لیتی ہوں۔“ وہ منہ بنا کر لا پرواہی سے گویا ہوئی۔

”کوئی ضرورت نہیں۔“ بڑے ابا ناراض سے انداز میں گویا ہوئے، اوریدا کے ساتھ ساتھ بڑی اماں نے بھی چونک کر ان کی طرف دیکھا، جو اپنی بے ساختگی پر کچھ خفت کا شکار ہوئے تھے اور اب اسے چھپانے کے لیے اخبار پر جھک گئے۔

”بڑے ابا! آپ بتائیں ناں۔۔۔“ ماہیر ان کے بالکل

پھکی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر دوڑ گئی۔

”لیکن آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ مجھے پڑھائی کے دوران مجبور نہیں کریں گی۔“ عابد مجید روڈ جیسی مصروف شاہراہ پر کھڑے ہو کر عدینہ نے اپنی ماں سے وعدہ لینا چاہا، آپا صالحہ ایک دم پریشان سی ہو گئیں۔

”ای پلیر۔۔۔“ عدینہ نے دائیں بائیں کھڑے لوگوں کی پرواہ کیے بغیر آپا صالحہ کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

”اچھا، اچھا ٹھیک ہے۔۔۔“ انہوں نے ایک دم ہی ہتھیار ڈال دیے۔۔۔ وہ دونوں کسی رکشے اور ٹیکسی کی تلاش میں ایس ڈی تک پہنچ گئی تھیں۔

”یہاں تو بہت ہی رش ہے۔۔۔“ عدینہ نے منہ بنا کر بھاگتی دوڑتی گاڑیوں کو دیکھا۔

”اسی روڈ پر ملٹری ہاسپٹل جو ہے۔“ آپا صالحہ نے لا پرواہی سے جواب دیا۔

”آپ رہی ہیں اس شہر میں۔۔۔؟“ عدینہ نے یونہی پوچھا۔

”میری تو پیدائش ہی اس شہر کی ہے۔۔۔؟“ ان کے منہ سے پھسلا تو عدینہ چونک گئی۔

”آپ آزاد کشمیر میں پیدا نہیں ہوئیں۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔ تمہارے نانا فوج میں تھے تو ان کی ان

دونوں یہیں پوسٹنگ تھی۔“ انہوں نے قدرے محتاط انداز میں جواب دیتے ہوئے ایک ٹیکسی والے کو اشارہ کیا۔

”اوہ، اچھا۔۔۔!“ عدینہ مطمئن ہو گئی تھی۔ دونوں ماں بیٹی ٹیکسی میں بیٹھ کر اسٹیشن موڑ کی طرف چل پڑیں جہاں سے انہیں اپنے شہر کی کو سٹر لینی تھی۔



اوریدا، بڑی اماں کے ساتھ پچھلے صحن میں موجود تھی اور بڑی اماں، بوارحمت اور ان کی بہو سے سردیوں کی آمد پر لحاف باہر نکلوا رہی تھیں تاکہ ان کو دھوپ لگوائی جاسکے۔ آج تو بڑے ابا بھی خلاف معمول وہاں موجود تھے اور کرسی پر اخبار پڑھتے ہوئے موسم سرما کی

سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

”مجھے کیا پتا اپنے باپ سے پوچھ لو جا کر۔“ انہوں نے بے رخی کے سارے ریکارڈ توڑے۔

”میرے نزدیک میرے باپ کے والد کی رائے زیادہ اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ وہ اسی پروفیشن سے تعلق رکھتے ہیں۔“ ماہیر نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

”جہاں یہ کہے کروادو وہاں۔“ انہوں نے لا پرواہ انداز سے کہا اور ذوق و شوق سے اخبار پڑھنے لگے۔

”لیکن مجھے تو آپ کی پسند کے مطابق ایڈمیشن لینا ہے۔“ اوریدانے بھی آج ہمت کر ہی لی تھی۔ ماہیر اس کی جرات پر مسکرایا اور چونکے تو بڑے ابا بھی تھے لیکن خاموش رہے اور ان کی یہ خاموشی قدرے فاصلے پر کھڑی بڑی اماں کو سخت ناگوار گزری تھی۔

”اب بچے بار بار پوچھ رہے ہیں تو بتادیں انہیں۔“ آپ بھی بعض دفعہ حد ہی کر دیتے ہیں۔“ بڑی اماں چڑ کر بولیں۔

”ہاں تو ارصم کے کالج میں ایڈمیشن لینے میں کیا حرج ہے۔“ وہ جھنجھلا کر اٹھے، اخبار کرسی پر رکھا اور بیزاری سے اندر چلے گئے۔

”دیکھو ذرا، رائے بھی ایسے دے کر گئے ہیں جیسے سر پر ڈنڈا مار کر گئے ہوں۔“ بڑی اماں سخت برا مان گئیں۔

”ارے اماں! جتا تو دیا ہے انہوں نے، بس فیصلہ ہو گیا۔“ ماہیر کی مسلسل مسکراہٹ انہیں مزید تپا گئی۔

”ایسے بتاتے ہیں بھلا، ارصم کی دفعہ تو کئی کئی گھنٹے بحث و مباحثہ چلتا تھا، جگہ جگہ فون کھڑکائے جاتے تھے اور ہماری دفعہ۔“ وہ چپ ہوئیں۔

”چلیں، کوئی بات نہیں، اس دفعہ انہیں علم ہے ناں کہ ارصم ہے وہاں۔“ ماہیر نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

”رہنے دو میاں! میں سب جانتی ہوں۔ اصل میں تو انہیں تم لوگوں سے کوئی دلچسپی ہے ہی نہیں۔“ بڑی اماں کا انداز خاصا دل دکھانے والا تھا، ایک لمحے کو تو دونوں بہن بھائی چپ کے حیب رہ گئے۔

”یہ سارا فساد اس بنیشن کا ڈالا ہوا ہے بھلا اتنے سالوں کی بدگمانی کی گرد اتنی جلدی تھوڑا چٹھتی ہے۔“ بڑی اماں تلخ انداز میں کہتے ہوئے وہاں رکھی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

”اچھا، آپ کیوں ٹینشن لیتی ہیں، ٹھیک ہو جائیں گے ناں وہ۔“ ماہیر نے ان کے کندھوں کو پیچھے سے آ کر نرمی سے دبایا جبکہ اوریدا کے سیل فون پر تیمور کی کال آگئی تھی۔ وہ فون اٹینڈ کرنے پھولوں کی باڑ کی طرف آگئی۔

”آپ کے بڑے ابا تو بہت خوش ہوئے ہوں گے، آپ کے رزلٹ سے۔“ سات سمندر پار بیٹھے تیمور کی خوش فہمیاں عروج پر تھیں۔

”جی ہاں۔“ اوریدانے مختصراً جواب دیا۔

”اسی لیے میں چاہتا تھا کہ تم ان کے پسندیدہ پروفیشن میں آؤ۔“ وہ پر جوش انداز میں بولے تو اوریدا مسکرا دی اب اتنا تو اسے بھی اندازہ تھا کہ بچوں کو ہر قسم کی آزادی دینے والے تیمور اگر کسی بات پر اڑ گئے تھے تو اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی بڑی وجہ یا جواز ضرور تھا۔

”اب تم بڑے ابا کے پاس بیٹھ کر روزانہ پڑھا کرنا۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے مشورہ دیا۔

”نہیں پاپا! میں ہاسٹل میں رہوں گی۔“ اوریدانے انہیں حیران کیا۔

”ایک ہی شہر میں رہ کر ہاسٹل میں رہنے کی کیا

ضرورت ہے؟“ انہوں نے فوراً اعتراض کیا۔

”ماہیر کا کہنا ہے کہ میں اس طرح اپنی تمام تر توجہ اسٹڈی پر مرکوز رکھوں گی اور ویسے بھی ہر ویک اینڈ پر وہ مجھے آکر لے جایا کریں گے۔“ اوریدانے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

”چلو، جو تم لوگ مناسب سمجھو۔“ وہ فوراً ہی

متفق ہو گئے پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد نولے بیٹا! تمہاری بنیشن آنٹی کا تمہارے رزلٹ پر کیا ریسپانس تھا؟“

”ٹھیک تھا پاپا۔“ وہ اتنی دور بیٹھے اپنے باپ کو

پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔
 ”انہوں نے تمہیں مبارک باد دی۔۔۔؟“ تیمور نے
 اگلا سوال بڑی بے تابی سے کیا۔
 ”نہیں۔۔۔“ اورید امزید جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔
 وہ ایک دم ہی چپ سے ہو گئے۔
 ”طیبہ پھپھو بہت خوش تھیں اور انہوں نے میری
 اس کامیابی کو باقاعدہ سہلیبویٹ بھی کیا تھا۔“ اس نے
 اپنے باپ کو خوش کرنے کی کوشش کی۔
 ”ہاں وہ آپ سے پیار بھی تو بہت کرتی ہیں۔۔۔“
 انہوں نے کہا پھر بولے۔

”ماہیر کہاں ہے؟ میری بات کرو اور اس سے۔“
 وہ جلدی سے سیل فون ماہیر کو پکڑا کر خود لان کی طرف
 چلی آئی۔ اس کا دل افسردگی کی گہری تہ میں لپٹا ہوا
 تھا۔

”اچھا تو ارصم جاوید! اب تمہارے پاس میرے
 لیے چند مبارک باد کے الفاظ بھی نہیں۔“ لاشعوری
 طور پر چلتے ہوئے ارصم کے پورشن کی طرف چلی آئی۔
 آغا جی بینش اور ارصم تینوں لان میں موجود تھے اور
 چائے پی رہے تھے۔ آغا جی نے اسے دیکھ کر محبت سے
 ہاتھ ہلایا، وہ نش و پنج کا شکار ہو گئی کہ ان کی طرف
 جائے یا نہ جائے، پھر کچھ سوچ کر وہ ان کی طرف برہ
 آئی اور سب کو مشترکہ سلام کیا۔ ارصم نے بے غور اس
 کا افسردہ سا انداز دیکھا اور پھر لا پرواہی سے چائے پینے
 لگا۔

”ہاں بھئی اورید! کیسی ہو بیٹا۔“ آغا جی ہمیشہ اس
 سے محبت سے ملتے تھے، البتہ بینش کے اعصاب کچھ
 تن سے گئے تھے لیکن خیریت رہی۔ انہوں نے سامنے
 میز پر رکھا انگلش اخبار اٹھایا اور بے نیازی سے پڑھنے
 لگیں۔

”ٹھیک ہوں آغا جی۔۔۔“ اس نے ست سے انداز
 میں جواب دیا۔

”کھڑی کیوں ہو، بیٹھو ناں۔“ آغا جی کے اصرار
 بھرے انداز پر وہ بیٹھ گئی، جبکہ ارصم کی لا تعلقی اسے
 تکلیف میں مبتلا کر رہی تھی۔

”کہاں ایڈمیشن لے رہی ہو تم۔“ آغا جی نے کاہو
 سے بھری پلیٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے یونہی
 پوچھا۔

”میرا ارادہ تو راولپنڈی میڈیکل کالج میں لینے کا تھا
 لیکن۔۔۔“ اورید کی بات پر ارصم کو دھچکا سا پہنچا۔
 ”لیکن کیا۔۔۔؟“ آغا جی حیران ہوئے۔

”لیکن بڑے ابا کہتے ہیں کہ میں AMC (آرمی
 میڈیکل کالج) میں جاؤں۔“ اورید کی بات پر بینش کو
 شاگ سا لگا، انہوں نے ناگوار سی بے چینی کے تحت
 پہلو بدلا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ ہاتھ میں پکڑا اخبار
 باقاعدہ غصے سے میز پر پٹا اور اپنا چائے کا کپ اٹھا کر اندر
 کی جانب برہ گئیں۔ آغا جی اور ارصم دونوں ہی اپنی
 اپنی جگہ پر خفت کا شکار ہوئے، جبکہ اورید اخوف زدہ سی
 نگاہوں سے بینش کو اندر جاتا دیکھنے لگی۔

”بھائی جان ٹھیک کہہ رہے ہیں، تمہیں اسی کالج
 میں ایڈمیشن لینا چاہیے۔“ آغا جی نے ماحول کو بدلنے
 کے لیے دانستہ ہلکا پھلکا انداز اپنایا، اورید خاموش
 رہی۔ آغا جی نے چونک کر دونوں کے چہروں کو غور سے
 دیکھا۔

”تم دونوں کا آپس میں کوئی جھگڑا چل رہا ہے کیا؟“
 آغا جی کے اچانک پوچھنے پر وہ دونوں ہی بوکھلا
 گئے۔

”نہیں۔ آغا جی۔۔۔“ ارصم نے گھبرا کر جواب
 دیا۔

”تم نے اورید کو اس کی کامیابی پر کیا گفت دیا ہے
 پھر؟“ انہوں نے کھوجتی نگاہوں سے ارصم کا پریشان
 چہرہ نکتے ہوئے پوچھا۔

”اس نے تو مجھے مبارک باد تک نہیں دی۔“
 اورید کا انداز شکایتی تھا، جبکہ ارصم کو توقع نہیں تھی
 کہ وہ اس طرح آغا جی کے سامنے کہہ دے گی اس لیے
 وہ ایک لمحے کو سٹپٹا سا گیا۔

”پوچھ سکتا ہوں میاں، اس قدر غیر اخلاقی حرکت
 کیوں کی آپ نے۔۔۔؟“ آغا جی نے اسے آڑے
 ہاتھوں لیا۔

پاس اب رونے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں تھا۔
”چلو میرے ساتھ۔۔۔“ وہ سنجیدگی سے کھڑا ہوا اس نے اسے چپ نہیں کروایا تھا۔ اور یہ اس کی بات پر حیران ہوئی۔

”فکر مت کرو، جہنم میں نہیں لے جا رہا تمہیں۔“
اس نے زبردستی اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا اور گاڑی میں لا بٹھایا۔ دس منٹ کے بعد وہ دونوں ایف ٹائن سکیٹر میں واقع پارک میں تھے۔

”یہاں بیٹھ کر جتنا رونا ہے رولو اور مجھے بتاؤ کہ تم ایسا کیوں کر رہی ہو میرے ساتھ۔“ ارصم نے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر باندھتے ہوئے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں آنسوؤں کے بہنے کی وجہ سے سرخ تھیں اور یہ سرخی ارصم کے دل کو تکلیف پہنچا رہی تھی۔

”میں کیوں روؤں۔۔۔“ اس نے بے دردی سے اپنے بازو سے آنسو صاف کیے۔
”پھر بولو کیوں کر رہی ہو تم ایسا۔۔۔؟“ وہ اب سنجیدگی سے بولا۔

”اس لیے کہ تم نے میرے ساتھ چیپٹنگ کی ہے اور تم مجھ سے جھوٹ بولتے رہے ہو۔“ وہ پھٹ پڑی۔
”اچھا، کب جھوٹ بولا میں نے۔۔۔؟“ وہ پر اعتماد انداز میں گویا ہوا۔

”تم نے اس دن مجھ سے کہا کہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ باہر جا رہا ہوں اور کچھ دیر بعد تم پی سی میں زرش کے ساتھ ڈنر کر رہے تھے۔“ اور یہ اس کی بات پر اسے زوردار جھٹکا لگا تھا۔

”اس میں جھوٹ بولنے والی کیا بات تھی اور پید! میں اپنے فرینڈز کے ساتھ ہی گیا تھا صدر اور مجھے اچانک زرش مل گئی وہ لاہور سے آئی ہوئی تھی اور اس نے مجھے ڈنر کی آفر کردی اور مجھے مناسب نہیں لگا کہ میں اسے انکار کروں۔“ اس کے لہجے سے بھی ناراضی چھلکی۔

”تو تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا تم اس سے ملنے جا رہے ہو۔“ اس کے پاس یوری چارج شیٹ تیار تھی۔

”اس نے بھی تو کون سا خود مجھے فون کر کے اپنے رزلٹ کا بتایا تھا۔“ اس کے پاس بھی ایک مضبوط جواز تھا۔ اب بوکھلانے کی باری اور یہ اس کی تھی۔ اس کو اندازہ نہیں تھا کہ ارصم کی طرف سے یہ اعتراض آئے گا۔
”یہ تو بہت بری بات ہے بیٹا۔۔۔“ آغا جی نے تاسف بھرے انداز میں اور یہ اس کی طرف دیکھا۔

”آئی ایم سوری آغا جی۔۔۔“ اور یہ اب بہت جلدی اپنی غلطی مان لیتی تھی اس لیے شرمندگی سے سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

”سوری مجھ سے نہیں، ارصم سے کریں۔ آپ دونوں کے درمیان جو غلط فہمیاں ہیں وہ دور کر لیں، میں ذرا جلال بھائی سے مل کر آتا ہوں۔“ آغا جی نے دانستہ دونوں کو تنہائی فراہم کی تھی۔

”مبارک ہو تمہیں بہت بہت۔۔۔“ آغا جی کے دور جاتے ہی ارصم نے سنجیدگی سے اور یہ اس کو مخاطب کیا۔
”تھینک یو۔۔۔“ وہ ابھی تک بوکھلاہٹ کا شکار تھی۔

”پوچھ سکتا ہوں کہ محترمہ میرے ساتھ کچھ عرصے سے ایسا کیوں کر رہی ہیں۔“ ارصم کا طنزیہ انداز اور یہ اس کو برہم کر گیا۔
”جب آپ کو یہ تک نہیں پتا تو کیا فائدہ بات کرنے کا۔۔۔“

وہ تپ کر کھڑی ہوئی اور ساتھ ہی ارصم جھنجھلا کر اٹھا۔ اس نے غصے سے اور یہ اس کا بازو پکڑا اور ناراض لہجے میں کہا۔

”خاموشی سے بیٹھ جاؤ یہاں ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“

”آپ سے برا کوئی اور ہو بھی نہیں سکتا میرے لیے۔“ اور یہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔
”ایک آنسو بھی نکلا تو جلن نکال دوں گا تمہاری۔۔۔“ اس نے انگلی اٹھا کر ہمیشہ کی طرح اسے وارننگ دی۔
”اتنی فالتو نہیں ہے میری جلن۔۔۔“ اس کے چہرے پر ارصم کو ہنسی آگئی۔ جب کہ اس کے مسکراتے پر اور یہ اس کو بے تحاشا غصہ آیا اور اس کے

”اوہ مائی گاڈ! بے وقوف لڑکی بتایا تو ہے، وہ مجھے اچانک مل گئی تھی، تم مجھ سے پوچھتیں تو سہی۔“
ارصم کو اس پر بے تحاشا غصہ آیا۔

”اور تم نے مجھے، میرے رزلٹ کی مبارکباد تک نہیں دی۔“ اس نے اگلی فرد جرم عائد کی۔

”جب تم سرمد بھائی کے ساتھ بیٹھ کر ہنس ہنس کر مجھے جلاؤ گی تو مجھ سے اس چیز کی توقع کیوں رکھتی ہو کہ میں تمہیں وش کروں گا۔“ اس کے پاس بھی اپنی ناراضی کی کئی وجوہات تھیں۔

”وہ میرے فرسٹ کزن ہیں۔“ اس نے جھنجھلا کر یاد دلایا۔

”تو پھر زرش بھی میری بچپن کی فرینڈ اور کلاس فیلو ہے۔“ اس نے بھی جوابی وار کیا۔

”تم اب زرش کو سرمد بھائی کے ساتھ ملاؤ گے۔“ وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر غصے سے اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

”جب تم میری ذرا سی بات پر ہرٹ ہو سکتی ہو تو میرے سینے میں بھی دل کی جگہ کوئی سیمنٹ کی تختی نہیں لگی ہوئی۔“ وہ منہ بنا کر ناراضی سے بولا۔ ”کتنی دفعہ تم سے پوچھا کہ تم مجھ سے اتنی خفا کیوں ہو، کتنی منتیں کیں، لیکن تم نے تو کچھ بھی نہ بتانے کی قسم کھا رکھی تھی۔“

”ہاں تو کیوں بتاتی۔“ وہ ہلکا سا چڑ کر سامنے رکھے بیچ پر جا کر بیٹھ گئی۔

”دوبارہ ایسی حرکت کرو گی تو تمہارا حشر نشر کروں گا میں۔“ وہ تپ کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اوریدا خاموش رہی۔

”میں تم سے کہہ رہا ہوں اس پارک کے درختوں سے نہیں۔“ وہ دھپ کر کے اس کے برابر جا بیٹھا۔ اوریدانے اس دفعہ بھی اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔

”اب کیا میں کسی تھرڈ کلاس فلم کے ہیرو کی طرح پارک میں چھلانگیں لگا لگا کرتاؤں کہ تم میرے لیے کتنی اہمیت کی حامل ہو۔“ اس کے بری طرح جھنجھلانے پر اوریدا کو ہسی آگئی۔

”جن کو ہم سے بے تحاشا محبت ہو، انہیں ایسے تنگ کرتے ہیں بھلا۔“ اس نے کندھے سے پکڑ کر اس کا رخ موڑا اور نرم لہجے میں پوچھا۔ اوریدا کو اپنی بے وقوفی کا پوری شدت سے احساس ہوا۔ اس نے گھبرا کر ارسم کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں محبت، نرمی اور شکووں کا ایک جہان آباد تھا۔ وہ بوکھلا کر کھڑی ہو گئی۔

”اب کیوں کھڑی ہو گئی ہو، بیٹھ کر میری بات سنو ناں۔“ اس کی بوکھلاہٹ ارسم کو لطف دے گئی۔

”گھر جا کر سن لوں گی۔“ وہ تھوڑا سا رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”اب دوبارہ کبھی مجھ سے بدگمان ہو کر جھگڑا کرو گی؟“ وہ بہت آرام اور سکون سے اس سے پوچھ رہا تھا۔

”نہیں۔“ اوریدانے صرف نفی میں سر ہلایا۔

”اب زبان کو کیوں تالا لگ گیا ہے، پہلے تو بہت برہم چڑھ کر الزام تراشی کر رہی تھیں مجھ پر۔“ وہ دونوں آہستگی سے چلتے ہوئے پارکنگ کی طرف برہم رہے تھے اور سامنے مارگلہ کی پہاڑیوں پر سورج غروب ہو رہا تھا لیکن ان دونوں کے اندر ایک روشن دن کے طلوع ہونے کی شروعات ہو چکی تھیں۔

”دوبارہ اس چپٹی ناک والی زرش کے ساتھ نظر آؤ گے تو چھوڑوں گی نہیں تمہیں۔“ اوریدانے ناک چڑھا کر اسے دھمکی دی۔

”یہی تو میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے مت چھوڑو۔“

وہ شرارتی انداز سے اس کے بالکل سامنے آن کھڑا ہوا۔

”اب ایسے بھی ہینڈ سم نہیں ہو تم۔“ اوریدا جھمنہی۔

”اچھا، یقین نہیں آتا تو آکر میری کلاس فیلوز سے پوچھ لو، پورے کالج میں سب سے زیادہ ڈشنگ ایم سی (مٹری گیڈٹ) کون ہے؟“ ارسم نے اسے چڑانے کی بھرپور کوشش کی۔

”میں کیوں پوچھوں۔“ اوریدا مسکرائی۔ ”مجھے معلوم ہے تم سے اچھا وہاں کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔“

اورید اکابرانا موڈ بحال ہو چکا تھا۔ ارصم نے بہت دن کے بعد کھل کر سانس لی۔ دونوں مسکراتے ہوئے اب گاڑی میں بیٹھ رہے تھے۔



”تم منہ اٹھا کر ارصم کے ساتھ چل دیں اور یہاں میں نے تمہاری تلاش میں کنوؤں میں پانس ڈلوا دیے۔“ وہ جیسے ہی گھر پہنچی بڑی اماں کا پارہ ہائی تھا۔ اورید اکو فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

”سوری بڑی اماں! میں ہی لے کر گیا تھا اسے۔“

ارصم نے کان کھجاتے ہوئے شرمندگی سے وضاحت کی۔

”تو میاں! اپنے ساتھ جاتے ہوئے اس کا باجا بھی لے جاتے۔“ وہ بیزار لہجے میں بولیں۔

”باجا...؟“ اورید اکو اور ارصم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف پریشانی سے دیکھا۔

”ارے وہ ہی موبائل فون اور کیا کہہ دیا ہے میں نے فارسی میں ایسا جو ٹکر ٹکر ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ رہے ہو۔“ بڑی اماں کی بات پر دونوں ہی بے اختیار ہنس پڑے کہ وہ سیل فون کو ”باجا“ کہہ رہی تھیں۔

”جاؤ۔ میرے لیے سبز قہوہ بنا کر لاؤ“ سر میں درد کر دیا میرے۔“ انہوں نے بے زاری سے کہا تو وہ مسکراتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی۔

”اللہ معاف کرے“ میرا تو خون خشک کر دیا اس لڑکی نے، سارا گھر چھان مارا اس کی تلاش میں۔“ وہ اب ارصم کے ساتھ بیٹھیں اپنا دکھڑا بیان کر رہی تھیں۔

”سوری بڑی اماں! مجھے خیال ہی نہیں رہا۔“

ارصم کو حقیقتاً شرمندگی ہو رہی تھی وہ بڑی اماں کی پریشانی کا اندازہ کر سکتا تھا۔

”تمہاری ارصم کے ساتھ صلح ہو گئی کیا۔؟“ وہ جو کچن میں قہوہ دم پر رکھ کر کھڑی تھی۔ ماہیر کی بات پر حیران رہ گئی وہ اچانک ہی اندر آیا تھا اور اب فریج میں سر دیے کوئی کھانے کی چیز ڈھونڈ رہا تھا۔

”میری ارصم کے ساتھ لڑائی ہی کب تھی۔“ وہ صاف مکر گئی۔

”بیٹا! اپنے بڑے بھائی کے ساتھ زیادہ استادی کرنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ فریج سے سیب نکال کر لے آیا اور اب شرارت سے اورید اکو کے دوپٹے سے صاف کرنے لگا اورید اکو نے گھور کر اسے دیکھا۔

”اس میں استادی کی کیا بات ہے۔“ اس نے لا پرواہی سے کہہ کر بڑی اماں کی پیالی کیبنٹ سے نکالی۔

”یہ جو پچھلے کچھ عرصے سے تم دونوں منہ لٹکائے گھوم رہے تھے وہ کیا تھا۔“ وہ اب مزے سے سیب کھاتے ہوئے بولا۔

”وہ تو میں اپنی اسٹڈی میں مگن تھی۔“ اورید اکو نے بھی آج نہ ماننے کی قسم کھا رکھی تھی۔

”اچھا پھر نظریں چرا کر کیوں بات کر رہی ہو“ میری طرف دیکھ کر کہو ناں۔“ ماہیر کی ہنسی اسے تیا گئی۔

”ہاں بتائیں کیا برا بلم ہے۔“ اس نے چڑ کر اپنے بھائی کا شرارتی چہرہ دیکھا۔

”کیا مسئلہ چل رہا تھا ویسے تم دونوں کے بیچ۔“ وہ شیلف سے ٹیک لگا کر مزے سے کھڑا ہو گیا۔

”آپ سے کس نے کہا کہ ہم دونوں کے درمیان کچھ چل رہا تھا۔“ اورید اکو نے بھی اطمینان سے دریافت کیا۔

”تم دونوں کی شکلیں چیخ چیخ کرتا رہی تھیں۔“ ماہیر نے اسے چڑایا۔

”تو پھر اس وقت کیوں نہیں پوچھا آپ نے۔“ اورید اکو نے قہوے میں چینی ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”تمہیں معلوم ہے میں کسی کی ذاتیات میں نہیں گھستا۔“ ماہیر اب لا پرواہی سے سیب کھا رہا تھا۔

”تو اب کیوں گھس رہے ہیں؟“ اورید اکو نے جواباً اسے تپانے کی کوشش کی۔

”ویسے ہی دل چاہ رہا تھا۔“ وہ بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا۔

”آپ کو کس نے بتایا کہ ہمارے درمیان صلح ہو گئی ہے۔“ اورید اکو نے الجھن بھرے انداز سے پوچھا۔

”انہوں نے طنزیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔“ اللہ جانے یہ کیسی محبت کی وبا چل پڑی ہے زمانے میں اپنے سدا کرنے والے پالنے پونے والے والدین ہی دشمن لگنے لگتے ہیں بچوں کو۔“ ان کی اس بات پر بخاور کا دل چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

”کل کو جب خود ماں بنو گی تو تمہیں اندازہ ہو گا“ والدین کس اذیت سے گزرتے ہیں جب نادان اولاد منہ زور ہو کر ان کے سامنے آن کھڑی ہو۔“ وہ نہ جانے کس بات کا غصہ بخاور پر اتار رہی تھیں، لیکن بخاور کی مجبوری تھی کہ وہ ان کے گھر میں موجود تھی اور یہ ساری باتیں اسے نہ چاہتے ہوئے بھی سنتا تھیں۔

”کل کلاں کو اللہ نے بی بی دے دی تو کیا بتاؤ گی اس کے سسرال والوں کو کہ اس کا ننھیال اور دوھیال کہاں ہے۔“ وہ بہت دور کی کوڑی لائیں۔

”وہ لوگ مان جائیں گے۔“ بخاور نے شرمندگی سے سر جھکا کر جواب دیا۔

”برامت ماننا بیٹا! وہ لوگ مان تو جائیں گے لیکن تمہاری اس غلطی کو کبھی نہیں بھلا میں گے ساری زندگی تمہاری اولاد کو طعنے ملیں گے اس بات کے۔“ سرفراز کی والدہ خطرناک حد تک صاف گو تھیں۔ بخاور کے پاس ان کی اس بات کا جواب نہیں تھا۔

”ویسے بھی جو مرد آج تمہارے لیے پیدا کرنے والے والدین اور محبت کرنے والے بہن بھائیوں کو چھوڑ دے اس کا کیا بھروسہ؟ کل کو کب کہاں تمہارا بھی ساتھ چھوڑ دے۔“ انہوں نے بخاور کا دل دھلایا۔

”ہاشم ایسا نہیں ہے۔“ بخاور نے کمزور سی آواز میں اس کا دفاع کیا۔

”مرد کو اس کے ظاہر سے پہچاننا ممکن ہے۔ وہ سباز کی طرح پرت در پرت کھلتا ہے اور پھر ساری زندگی اس عورت کو رلاتا ہے جو محبت کے سفر میں اپنے والدین کی عزت کا سودا کر کے اس کا ساتھ نبھانے چل پڑتی ہے۔“ وہ تلخ لہجے میں کہتے ہوئے بخاور کے دل پر

”لاؤنج میں بڑی اماں کے پاس بیٹھا رسم جو آج بے وقوفوں کی طرح ہریات پر ہنس رہا ہے۔ بچن میں آیا تو تم مسکرا رہی تھیں۔ میں نے سوچا تم سے ہی پوچھ لوں کہ آخر کون سا زعفران کا کھیت دیکھ کر آئے ہو تم دونوں؟“

ماہیر کے مذاق اڑاتے انداز پر اوریدا مسکرائی۔

”ویسے بہت تیز ہیں آپ۔“

”اور بہت بے وقوف ہو تم دونوں ناراض ہوتے ہو تب چہرے پر افسردگی کے سینر آویزاں کر کے گھومتے ہو اور خوش ہوتے ہو تو تب بھی ساری دنیا کو تپا چل جاتا ہے۔“ ماہیر بچن سے نکلتے نکلتے اوریدا کو حیران کر گیا۔ وہ ہلکی سی خفت کا شکار ہوئی اور اگلے ہی لمحے مسکراتے ہوئے قہوے کی پیالی ٹرے میں رکھنے لگی۔



”کس شہر سے تعلق ہے تمہارے سسرال والوں کا؟“ بخاور نے پریشانی سے سرفراز کی والدہ کا چہرہ دیکھا۔ انہیں وہاں رہتے ہوئے تیسرا دن تھا اور ہاشم کے دوست سرفراز کی والدہ رات ہی انگلینڈ سے پاکستان پہنچی تھیں بخاور کا رات تو ان سے سامنا نہیں ہوا، صبح ناشتے کی میز پر ملاقات ہوئی تو وہ کچھ دیر کے بعد اس کے کمرے میں آن پہنچیں اور اب کسی سخت کمیشن کی طرح اس سے انٹرویو لے رہی تھیں۔

”کس شہر میں رہتے ہیں تمہارے سسرال والے۔“ انہوں نے سنجیدگی سے اپنا سوال دہرایا۔

”جی ریوہ میں۔“ بخاور نے سر جھکا کر جواب دیا۔

”کتنے بہن بھائی ہیں تمہارے میاں کے۔“ وہ چائے پیتے ہوئے بڑے اطمینان سے بولیں۔

”شاید چار۔“ اس نے اندازہ لگا کر جواب دیا۔

”یہ شاید سے کیا مراد ہے تمہاری؟ تم ان سے ملی نہیں ہو کیا؟“ ان کے انداز میں ہلکی سی ناگواری جھلکی۔

”نہیں۔“ بخاور نے شرمندگی سے جواب دیا۔

”ہاں بتایا تھا مجھے سرفراز نے کہ تمہاری لومیرج

نئی پھریاں ایک ساتھ چلا گئیں۔

”آپ کے بیٹے نے بھی تو فائزہ بھابھی سے پسند کی شادی کی ہے۔“ بختاور کے ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔
”وہ اسے کورٹ پچھری سے گزار کر اپنے گھر نہیں لایا بیٹا! ساری دنیا کے سامنے بیاہ کر عزت سے لے کر آیا تھا اس گھر میں۔“ بختاور کو لگا جیسے کسی نے ایک زور دار طمانچہ اس کے منہ پر رسید کر دیا ہو۔

”مجھے تم کسی نیک ماں باپ کی اولاد لگتی ہو، لیکن یہ حرکت تم نے اچھی نہیں کی۔“ انہوں نے کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”اماں! کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ، انھیں آپ کی میڈیسن کا ٹائم ہو گیا ہے۔“ فائزہ بھابھی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اپنی ساس کا زہر میں بجھا جملہ سنا تو ساری بات ان کی سمجھ میں آگئی۔

وہ اب شرمندگی سے بختاور کا دھواں دھواں سا چہرہ دیکھ رہی تھیں، جو آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں لال ہو رہا تھا۔



”آنکھ کان کھول کر رہنا ہو شل میں۔“ بڑی اماں صبح سے اسے نصیحتیں کر رہی تھیں۔ اوریدا کا میڈیکل کالج میں ایڈمیشن ہو گیا تھا اور ماہیر زبردستی اس کے ہو شل۔ میں بھی ڈاکو منٹس جمع کروا آیا تھا اور اوریدا کو وہاں جانے کا سوچ کر ہی کوفت ہو رہی تھی۔

اوپر سے بڑی اماں اٹھتے بیٹھتے اسے سمجھانے کا فریضہ سرانجام دے رہی تھیں جو اوریدا کے لیے اب ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔

”سن لیا ناں تم نے میں نے کیا کہا ہے، ہو شل میں ہوشیاری سے رہنا۔“

”آپ تو یوں کہہ رہی ہیں جیسے میں ہو شل میں نہیں، اپنے سرال میں جا رہی ہوں۔“ اوریدانے پکینگ کرتے ہوئے بے زاری سے جواب دیا۔

”ہو شل کون سا کسی سرال سے کم ہوتا ہے۔ بھانت بھانت کی تو لڑکیاں ہوتی ہیں وہاں۔“ بڑی اماں

نے اس کے ہاتھ سے کپڑے پکڑ کر خود تہہ کر کے اٹیچی کیس میں رکھنے شروع کر دیے۔

”تو مجھے کون سا شوق تھا وہاں جا کر رہنے کا؟ یہ تو ماہیر بھائی کی ضد تھی۔“ اوریدا کا صبح سے موڈ خراب تھا۔
”ٹھیک کہتا ہے وہ، یہاں تو سارا دن تم ٹی وی کے سامنے منہ اٹھا کر بیٹھی رہتی ہو۔“ بڑی اماں نے منہ ہٹا کر اسے یاد دلایا۔

”اب اتنا بھی ٹی وی نہیں دیکھتی ہوں میں، جتنا آپ شور مچا رہی ہیں۔“ اسے غصہ آ ہی گیا۔
”رہنے دو، سب پتا ہے مجھے۔“ انہوں نے ناک سے مکھی اڑائی۔

”فرانی ڈے کو ڈرا پور یاد سے بھجوا دیجئے گا۔“ اوریدانے بیزاری سے اٹیچی کیس بند کرتے ہوئے یاد دلایا۔

”لو ابھی گئی ہیں نہیں، اور آنے کی فکر پہلے سے پڑ گئی۔“ بڑی اماں کو ہنسی آگئی۔

”آپ کو کیا پتا، کتنا دل خراب ہو رہا ہے میرا۔“ اوریدا کی آنکھیں نم ہوئیں۔

”اچھا اچھا، اب آنسو بہانے کی ضرورت نہیں، دس پندرہ دن رہ کر دیکھو ہو شل میں، اگر دل نہ لگا تو واپس آ جانا۔“ بڑی اماں کا دل پیسج گیا۔

”لیکن ماہیر بھائی۔“ اوریدانے دکھی انداز سے انہیں یاد دلانے کی کوشش کی۔

”دیکھ لوں گی میں اس کو بھی، اب کیا زبردستی گھر

سے نکالے گا بچی کو۔“ اوریدا کو بڑی اماں کے محبت بھرے انداز پر ایک دم ہی پیار آیا اور وہ ان سے بے ساختہ لپٹ گئی۔ اس کا یہ انداز بڑی اماں کے دل پر کسی پرانی یاد کی دستک دے گیا۔

”قسم سے بڑی اماں! آپ دنیا کی سب سے عظیم گرینڈ مدر ہیں۔ آپ کی عظمت کو سلام۔“ وہ ان سے لپٹی اپنی محبت کا اظہار کر رہی تھی۔ بڑی اماں کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئیں۔

”یہ آپ کو کیا ہوا۔؟“ اوریدا کو ان کے بوڑھے وجود میں لرزش کا احساس ہوا تو وہ فوراً پیچھے ہٹی، بڑی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
 - ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
 - ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
 - ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
 - ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
 - ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
 - ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
 - ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
 - ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
 - ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
 - ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
 - ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
 - ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

جھک کر پکارا، وہ رکے اور ید اہمت کر کے ان کے پاس پہنچی، انہوں نے دیکھا وہ سر جھکائے اپنے ہاتھوں کو مسلتے ہوئے خوف زدہ ہنی کی مانند کھڑی تھی۔
”میں جا رہی ہوں۔“ اور ید ا کے منہ سے اٹک اٹک کر نکلا۔

”خدا حافظ۔۔۔“ وہ سپاٹ لہجے میں کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

اور ید ا کا دل ایک دم ہی خراب ہوا اور اسے ماہیر کا فیصلہ درست محسوس ہونے لگا۔ بڑے ابا کا دل دکھاتا انداز اسے اگلے کئی گھنٹے افسردہ رکھنے کے لیے کافی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ماہیر جب اسے ہوشل چھوڑنے جا رہا تھا، وہ بالکل خاموش تھی، ماہیر کی سمجھتا رہا کہ وہ گھر سے دوری کی وجہ سے افسردہ ہے۔ اس لیے اس نے بھی اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔

عائشہ ہال میں اپنے کمرے تک پہنچنے کے عرصے کے دوران اس کے ہونٹوں پر تالا لگا رہا، اس کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا، اس کا مطلب تھا کہ اس کی روم میٹ آچکی تھی۔ اس نے دروازہ ہلکا سا ناک کیا۔ کمرے میں پہلے سے موجود لڑکی جو اس وقت اپنی الماری سیٹ کر رہی تھی، اس کی پشت اور ید ا کی طرف تھی، دروازے پر دستک کی آواز پر وہ مڑی اور اور ید ا کو دیکھتے ہی اسے جھٹکا لگا، وہ سخت حیرانی سے اور ید ا کی شکل دیکھ رہی تھی۔

”میں اور ید ا ہوں، میری اس کمرے میں الاٹمنٹ

ہوئی ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے اپنا تعارف کروایا۔
”مجھے عدینہ کہتے ہیں۔ نائس ٹومیٹ یوس۔“ عدینہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھایا۔ اور ید ا کے چہرے پر ایک دوستانہ مسکراہٹ اور عدینہ کے چہرے پر حیرت، بے یقینی اور پریشانی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

For Next Episodes
Stay Tuned To
paksociety.com

248 2015

اماں بے آواز رو رہی تھیں۔
”آپ کہتی ہیں تو میں نہیں جاتی۔۔۔“ اور ید ا نے اپنی سمجھ کے مطابق اندازہ لگایا کہ وہ شاید اس کے جانے پر دکھی ہو رہی ہیں۔
”ایسا تو میں نے نہیں کہا۔۔۔“ انہوں نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔

”چلو اپنا سامان سمیٹو، میں تمہارے بڑے ابا کو چائے بنا کر دے آؤں۔“ وہ اپنی آنکھیں شال سے صاف کرتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

”کس نے کہا ہے اسے ہوشل بھجوانے کو۔؟“ وہ چائے کا کپڑے میں رکھے اسٹڈی روم میں داخل ہوئیں تو جلال صاحب کو برہم پایا۔
”کس کو۔۔۔؟“ بڑی اماں اپنی ہی دھن میں تھیں، اس لیے بالکل نہیں سمجھیں۔

”میں تمہارے صاحبزادے کی اولاد کی بات کر رہا ہوں۔“ وہ طنزیہ انداز سے گویا ہوئے۔

”ظاہر ہے اس کا باپ اور بھائی موجود ہے، وہی کہیں گے۔“ بڑی اماں نے بھی زورٹھا سا انداز اپنایا۔
”اس کے باپ کو کیا اب بھی عقل نہیں آئی، اسے سمجھاؤ کہ ماضی کے تلخ تجربات سبق سیکھے، کیوں اپنے گھر کو آگ لگانا چاہتا ہے۔“ بڑے ابا سخت جلالی موڈ میں تھے اور ان کی بات پر ایک تلخ سی مسکراہٹ بڑی اماں کے لبوں پر آکر ٹھہر گئی۔
”ہر انسان اپنے ہی تجربے سے سیکھتا ہے۔“ وہ

پھیکے سے انداز سے مسکراتے ہوئے گویا ہوئیں۔
”میری بلا سے کل کو وہ بھی سر پکڑ کر روتا پھرے گا“ اپنے باپ کی طرح۔
”وہ پاؤں پیٹتے ہوئے اسٹڈی روم سے نکلے اور اندر داخل ہوتی اور ید ا سے ٹکرائے جو انہیں خدا حافظ کہنے کے لیے غلت بھرے انداز میں آ رہی تھی۔

”آئی ایم سوری بڑے ابا۔“ وہ ایک دم ڈر سی گئی۔
بڑے ابا نے ایک سرد نگاہ اس پر ڈالی اور کچھ بھی کہے بغیر اپنے کمرے کی طرف بڑھے۔
”بڑے ابا۔“ اور ید ا نے انہیں پیچھے سے ہلکا سا

READING
Section